DATA ENTERED

26626

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین

الحمد للہ رب العلمین وسلام علی المرسلین لاسیما علی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک ہر فرد مسلم جو قرآن مجید سے کسی حد تک بھی واقف ہے اور یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، وہ اس عقیدے کا معتقد اور اس دعوے کا مدعی ضرور رہا اور رہے اور قیامت تک ہر مسلم کا یہ عقیدہ اور یہ دعوے رہے گا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ ایک ایسا پائیدار، ناقابلِ انکار کھلا اور روشن معجزہ ہے جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکتی۔ سارے عالم کے تمام جن وانس بھی چاہیں کہ سب مل کر اس کی مثال بنا کر پیش کریں تو نہیں کر سکتے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بڑے بڑے فصحا و بلغا نے ایسا کرنا چاہا مگر ان کو اپنی ناکامی اور اپنی سعی کی ہیچ انجامی کا اعتراف کرنا پڑا۔

قرآن مجید کے ایسے روشن معجزہ ہونے کا دعویٰ نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ خود قرآن مجید نے بآوازِ بلند اس کی تحدی کی اور تمام منکرین کو ببانگ دہل اس کی مثال پیش کرنے کا چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا مگر منکرین کی دنیا اس چیلنج کے متعلق ایسی شہر خموشاں بنی رہی کہ صدائے برنخواست۔ سورۂ ہود میں ہے:-

أم يقولون افتراه قل فأتوا بعشر سور مثله مفتريات وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صدقين ○ فالم يستجيبوا لكم فاعلموا انما انزل بعلم الله وان لا اله الا هو فهل انتم مسلمون ○

کیا یہ منکرین کہتے ہیں کہ رسول نے (اپنی طرف سے یہ آیتیں بنا کر اللہ تعالیٰ پر) ان کا افترا کیا ہے؟ کہہ دو تو ایسی ہی افترائی دس سورتیں تم (بھی) بنا کر لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو بھی پکار سکو پکار و (اور اس کام میں اس کی مدد حاصل کرو) اگر تم (اس الزام افترا میں) سچے ہو تو جب یہ منکرین تمہارے اس چیلنج کو قبول نہ کریں (اور گریز کریں) تو اے مسلمانو! سمجھ لو کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، تو پھر تم تو مسلمان ہونا ہی!

یہ کھلا ہوا چیلنج جب کفار و مشرکین عرب کے پاس پہنچا تو وہ بہت گھبرائے کیونکہ قرآن مجید کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا سکہ ان کے دل پر بیٹھا ہوا تھا مگر اپنی دلی خفت مٹانے کے لئے ہٹ دھرمی کے ساتھ یوں بول گئے تھے کہ قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل هذا (یعنی ہاں ہم نے سنا، اگر ہم بھی چاہتے تو ایسا کہہ دیتے) اگر چاہتے تو ایسا کہہ دیتے مگر چونکہ چاہتے نہیں ہیں اس لئے، یہ صریح ہٹ دھرمی کا جواب ہے۔ اس کھلے چیلنج کے بعد بھی اگر نہیں چاہتے تو کب چاہتے۔ اور ان کی رگ غیرت ... غرض قرآن ہے۔ دنیا کا کوئی صاحب عقل و

اس ہٹ دھرمی کے جواب کا یوں جواب دیا گیا: قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا (کہہ دو اے رسول (کہ تم کیا ہو) اگر تمام جن و انس اس بات کے لئے مجتمع ہوں کہ اس قرآن کی مثال بنا کر لائیں، تو اس کی مثال نہیں لا سکتے، اگرچہ بعض بعض کے مددگار ہو جائیں۔

اس کے بعد پھر دوبارہ اس پہلے چیلنج کو اور پرزور کر کے یوں پیش کیا گیا۔ ام یقولون افترٰہ ؕ قل فاتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ۰ (یہ منکرین ابھی تک) یہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کو رسول نے (اپنی طرف سے) بنا کر اللہ تعالیٰ پر افترا کیا ہے؟ کہہ دو کہ لے آؤ ایسا ایک سورہ بھی (بنا کر) اور اللہ کے سوا جن کو بھی (اپنی مدد کیلئے) پکار سکو پکار لو اگر تم سچے ہو۔ فبھت الذی کفر تو پھر یہ سن کر ہر منکر مبہوت ہو کر رہ گیا اور کچھ جواب نہ چلا۔

فاتحۃ الکتاب یعنی سورہ فاتحہ جو قرآن کا مقدمہ یعنی دیباچہ ہے اس کے بعد پہلے پہل جو سورہ آپ کے سامنے آتا ہے اس کی پہلی آیت قرآن مبین کا ایک بہت بڑا دعویٰ ہے۔ فرمایا گیا: ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ (یہ کتاب اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں) ھدی للمتقین ۰ (تقویٰ والوں کے لئے سامان ہدایت ہے) تقویٰ والے کون ہیں اس کو اسی قرآن میں بتا دیا گیا ہے: الذی جاء بالصدق وصدق بہ اولٰئک ھم المتقون (جو شخص سچائی لے کر آیا اور سچائی کے سچائی ہونے کو مان کر اس کا اعتراف اس نے کر لیا ایسے ہی لوگ متقی ہیں) اور اس کے برعکس ہٹ دھرم ہیں۔ یعنی ہٹ دھرم وہ ہے جو سچی بات کو سچی بات جانتے ہوئے بھی اس کا انکار کرے اور کبھی اس کو تسلیم نہ کرے، تو جو شخص ہٹ دھرم ہو گا اس کو قرآن سے کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، وہ تو ماننے والا ہی نہیں، ہاں جو شخص سچا ہو اور سچی بات مان لیتا ہو بس وہی قرآنی ہدایات سے مستفیض ہو سکتا ہے۔

قرآن کو تین جماعتوں سے سابقہ پڑا۔ ایک جماعت متقین کی جو سچے تھے اور سچی بات مان لینے کے عادی تھے، یہی لوگ۔ چونکہ ایسے تھے جو قرآن مجید سے فائدہ ہدایت اٹھا سکتے تھے اور قرآن درحقیقت انہیں کے لئے نازل ہوا۔ اس لئے سب سے پہلے انہیں کا ذکر کیا گیا۔ چونکہ ایسے لوگ کچھ اہل کتاب میں بھی تھے۔ اور کچھ امیوں میں بھی یعنی جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ تھی۔ اس لئے ان دونوں جماعتوں کے متقین کا ذکر یوں فرمایا گیا کہ پہلے "الذین" سے امیین کے اہل تقویٰ اور پھر "والذین" سے اہل کتاب کے اہل تقویٰ کی تصریح کرتے ہوئے دونوں جماعتوں کے متقین کے متعلق فرمایا گیا کہ

اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

متقین کے بعد ان کی ضد یعنی ہٹ دھرمیوں کا ذکر کیا یعنی دوسری جماعت جس سے قرآن کو سابقہ پڑا، وہ ان ہٹ دھرموں کی جماعت یا سن کر وہ انکار ہی کی ٹھان لی ہے ان کو نتیجۂ کفر سے ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس جماعت اللہ بلا چون و چرا فرمایا گیا کہ

Marfat.com

ختم اللہ علیٰ قلوبہم وعلیٰ سمعہم وعلیٰ ابصارہم غشاوۃ ولہم عذاب عظیم

اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔

تیسری جماعت جس سے قرآن کو سابقہ پڑا وہ منافقین کی جماعت ہے۔ ان کا حال بیان کر کے ان کا حکم بیان فرمایا گیا کہ

اولٰئک الذین اشتروا الضلٰلۃ بالھدیٰ فما ربحت تجارتھم وما کانوا مھتدین

یعنی یہ وہ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت دے کر خرید لیا۔ مگر ان کی یہ تجارت ان کے لئے سود مند نہ ہوئی اور یہ (سچے ہدایت یافتوں کے ساتھ گھلے ملے رہنے کے باوجود) ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔

پھر ان منافقین کے مناسب حال دو مثالیں دے کر سمجھایا اور یہ مضامین پہلے ہی سورہ یعنی سورۂ بقرہ کے پہلے ہی دو رکوع میں دوسرے مضامین سے پہلے بیان فرمائے گئے۔ تیسرے رکوع میں پورے عالم انسانیت کو مخاطب کر کے ان کو صرف اپنے رب کے بندے بنے رہنے اور شرک سے بچنے کی طرف دعوت دی گئی، جو قرآن کی اصل ہدایت ہے۔ اس کے بعد ہی ہٹ دھرموں پر اتمام حجت کے لئے ایک زبردست تحدی کی جاتی ہے یعنی منکرین اور مذبذبین کو ایک کھلا چیلنج دیا جاتا ہے کہ

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکٰفرین

اور اے لوگو! اگر تم کسی شک میں ہو اس چیز کے بارے میں جس کو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو ایسا ایک سورہ بھی بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو پکارو، اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو (یعنی ایک سورہ بھی ایسا بنا کر نہ لا سکو) اور کبھی نہ کر سکو گے، تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے جو کافروں کے لئے تیار رکھی ہے۔

شروع میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ کتاب لاریب فیہ ہے، اس میں ریب و شک کی گنجائش ہی نہیں، یہاں اتمام حجت کے لئے فرمایا ہے کہ تم کو اس کتاب میں کچھ شک ہو تو ایسا ایک سورہ بھی بنا کر لاؤ۔ پھر یہ بھی پیشین گوئی خود ہی فرما دی کہ تم ایسا کوئی سورہ بھی بنا کر نہ لا سکو گے اتنا بڑا زبردست چیلنج وہ بھی بالکل غیر مشروط تقریباً پونے چودہ سو برس سے آج تک آسمان کے گنبد گرداں میں ہر ہر طرف گونج رہا ہے مگر اس وقت سے اس وقت تک تمام منکرین و مذبذبین سر بہ درگلو مبہوت و خموش ہی رہے جیسے کسی کے منہ میں زبان ہی نہیں کیا اس کتاب کی لاریبیت اور منجانب اللہیت کے لئے ایسے زبردست اتمام حجت کے بعد بھی کسی مزید حجت طلبی کی گنجائش باقی ہے۔

یہ لاریبیت اس کے تمام دعووں کی صداقت سے متعلق ہے، اس لئے کہ اس کتاب کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے، حق ہے، رحمت ہے، اور تمام عالم کے لئے سامان ہدایت ہے۔ اگرچہ نفع بخش یہ متقین کے لئے ہے لیکن ہٹ دھرم منکرین اور تذبذب و شک کے مبتلاؤں کے حق میں اتمام حجت ہے۔ اس کی ہر تعلیم ساری دنیا کے لئے باعث ترقی دنیوی و فلاح اخروی ہے۔ اس کتاب کی تعلیم سے روگرداں رہ کر کوئی شخص، کوئی قوم، کبھی صحیح کامیابی نہیں حاصل کر سکتی۔ غرض قرآن کا یہ دعوےٰ لاریب فیہ ہے، اس کی ہر تعلیم، ہر عبارت، ہر جملہ بلکہ ہر حرکت و سکون لاریب فیہ ہے۔ دنیا کا کوئی صاحب عقل صریح ہٹ دھرم

ہوش اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

قرآن کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس میں لفظاً و معنیً کسی طرح کا اختلاف نہیں:

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً (پ۵)

اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت سے اختلاف پاتے

ظاہر ہے کہ جو کتاب ۲۳ برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے مختلف احوال اور مختلف ماحول میں لوگوں کے سامنے آئے اور اس میں کبھی کسی طرح کا رد و بدل نہ ہو۔ ضروری ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ماحول کی وجہ سے اگر کوئی انسان اس کا مصنف ہوتا تو متضاد باتیں بولنے پر مجبور ہوتا کیونکہ آئندہ کا علم کسی انسان کو نہیں جو اس کی رعایت رکھتے ہوئے بولا کرے۔ مگر اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہے ابتدا ہی سے یکساں انداز بیان رکھا۔ مسلمانوں کے ضعف و مظلومیت کے زمانے میں بھی قرآن کا لب و لہجہ کبھی کمزور نہ رہا۔ غرض قرآن میں دعوٰئے عدم اختلاف بھی اپنی لاریبیت کی ایک خاص شان رکھتا ہے۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت ہی قرآن کا اصلی اعجاز نہیں

قرآن کی فصاحت و بلاغت جس طرح معجزانہ ہے اسی طرح قرآن کی ہر تعلیم معجزانہ ہے، ہر طرز بیان معجزانہ ہے، قرآن کے امثال معجزانہ ہیں، غرض قرآن مجید کی ہر چیز ایک نہ ایک عنوان ضرور رکھتی ہے۔ اس لئے معیار اعجاز کے لئے صرف اس کی فصاحت و بلاغت کو پیش کرنا در اصل قرآن کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

قرآن کا اعجاز کیسا ہونا چاہیئے

قرآن کے مخاطب عہد نبوی سے لیکر قیامت تک کے سارے جن و انس ہیں۔ یہ کتاب تمام عالم کے لئے ہدایت ہے اس لئے اس کتاب کو تمام عالم کے لئے معجزہ ثابت ہونا چاہیئے صرف اس کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز کو اہل عرب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یا وہ عجمی جو ادب عربی سے پوری طرح واقف ہوں۔ اس کی سیاسی تعلیمات کے اعجاز کو ماہرین سیاست ہی بھانپ سکتے ہیں۔ اس کی قانونی و آئینی ہدایات کی معجزیت کو قانون داں حضرات ہی جان سکتے ہیں۔ اس کی نفسیاتی معجزانہ عنوان موعظت و انداز بیان کو فلسفیان نفسیات ہی تاڑ سکتے ہیں اور اس کے سراپا اعجاز تعلیم حکمت و تزکیۂ نفس کا اعتراف نفس زکیہ والے حکماء ہی کو ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی بات ایسی بھی ضرور ہونی چاہیئے جو بلا تفریق طبقات و قبائل و بلا امتیاز امیال و عواطف ہر دور میں ہر انسان پر اس کتاب کے اعجاز کو ایسی وضاحت و ہدایت کے ساتھ ثابت کرتی رہے جس سے کسی سچے شخص کو انکار ممکن نہ ہو اور پھر وہی بات قرآن کا اصلی اعجاز سمجھی جائے گی۔

قرآن کا اصلی اعجاز

قرآن کا اصلی اعجاز اس کی لاریبیت ہے یعنی کوئی صاحب عقل و ہوش بھی اگر وہ سچا آدمی ہے اور سچی بات کی سچائی کا اعتراف و دیانت کے ساتھ کرنے کا خوگر ہے تو اس کتاب کے حالات و مضامین کو دیکھ کر یا سن کر وہ مجبور ہوگا کہ بغیر کسی ریب و شک کے اس کتاب کو منزل من اللہ، اس کی آیتوں کو کلام اللہ اور جن پر یہ کتاب اتری ان کو رسول اللہ بلا چون و چرا تسلیم کرلے اور یہی اس کتاب کا اصلی اعجاز ہے۔

Marfat.com

DATA ENTERED

26626

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین

الحمد للہ رب العلمین وسلام علے المرسلین لاسیما علی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی

الہ وصحبہ اجمعین

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک ہر فرد مسلم جو قرآن مجید سے کسی حد تک بھی واقف ہے اور یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، وہ اس عقیدے کا معتقد اور اس دعوے کا مدعی ضرور رہا اور ہے اور قیامت تک ہر مسلم کا یہ عقیدہ اور یہ دعوے رہے گا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ ایک ایسا پائیدار، ناقابل انکار کھلا اور روشن معجزہ ہے جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکتی۔ سارے عالم کے تمام جن وانس بھی چاہیں کہ سب مل کر اس کی مثال بنا کر پیش کریں تو نہیں کر سکتے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بڑے بڑے فصحا و بلغا نے ایسا کرنا چاہا مگر ان کو اپنی ناکامی اور اپنی سعی کی ہیچ انجامی کا اعتراف کرنا پڑا۔

قرآن مجید کے ایسے روشن معجزہ ہونے کا دعویٰ نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ خود قرآن مجید نے باآواز بلند اس کی تحدی کی اور تمام منکرین کو ببانگ دہل اس کی مثال پیش کرنے کا چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا مگر منکرین کی دنیا اس چیلنج کے متعلق ایسی شہر خموشاں بنی رہی کہ صدائے برنخاست۔ سورۂ ہود میں ہے:-

ام یقولون افترٰہ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریت وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ۰ فالم یستجیبوا لکم فاعلموا انما انزل بعلم اللہ وان لا الٰہ الا ھو فھل انتم مسلمون۰

کیا یہ منکرین کہتے ہیں کہ رسول نے (اپنی طرف سے یہ آیتیں بنا کر اللہ تعالیٰ پر) ان کا افترا کیا ہے؟ کہہ دو تو ایسی ہی افترائی دس سورتیں تم (بھی) بنا کر لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو بھی پکار سکو پکار لو (اور اس کام میں اس کی مدد حاصل کرو) اگر تم (اس الزام افترا میں) سچے ہو تو جب یہ منکرین تمہارے اس چیلنج کو قبول نہ کریں (اور گریز کریں) تو اے مسلمانو! سمجھ لو کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، تو پھر تم تو مسلمان ہونا؟

یہ کھلا ہوا چیلنج جب کفار و مشرکین عرب کے پاس پہنچا تو وہ بہت گھبرائے کیونکہ قرآن مجید کی معجزانہ فصاحت وبلاغت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا مگر اپنی دلی خفت مٹانے کے لئے ہٹ دھرمی کے ساتھ یوں بول گئے تھے کہ قد سمعنا، لو نشا (یعنی ہاں ہم نے سنا، اگر ہم بھی چاہتے تو ایسا کہہ دیتے) اگر چاہتے تو ایسا کہہ دیتے مگر چونکہ چاہتے نہیں ہیں اس لئے غرض قرآن صریح ہٹ دھرمی کا جواب ہے۔ اس کھلے چیلنج کے بعد بھی اگر نہیں چاہتے تو کب چاہتے۔ اور ان کی رگ غیرت ... دنیا کا کوئی صاحب عقل

Marfat.com

اس ہٹ دھرمی کے جواب کا یوں جواب دیا گیا: قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا کہہ دو (اے رسول کہ تم کہا ہو) اگر تمام جن وانس اس بات کے لئے مجتمع ہوں کہ اس قرآن کی مثال بنا کر لائیں، تو اس کی مثال نہیں لاسکتے، اگرچہ بعض بعض کے مددگار ہو جائیں۔

اس کے بعد پھر دوبارہ اس پہلے چیلنج کو اور پرزور کر کے یوں پیش کیا گیا۔ ام یقولون افترٰہ قل فاتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ۰ (یہ منکرین ابھی تک) یہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کو رسول نے (اپنی طرف سے) بنا کر اللہ تعالیٰ پر افترا کیا ہے؟ کہہ دو کہ لے آؤ ایسا ایک سورہ بھی (بنا کر) اور اللہ کے سوا جن کو بھی (اپنی مدد کیلئے) پکار سکو پکارو اگر تم سچے ہو۔ فبھت الذی کفر تو پھر یہ سن کر ہر منکر مبہوت ہو کر رہ گیا اور کچھ جواب نہ چلا۔

فاتحۃ الکتاب یعنی سورہ فاتحہ جو قرآن کا مقدمہ یعنی دیباچہ ہے اس کے بعد پہلے پہل جو سورہ آپ کے سامنے آتا ہے اس کی پہلی آیت قرآن مبین کا ایک بہت بڑا دعویٰ ہے۔ فرمایا گیا: ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ (یہ کتاب اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں) ھدی للمتقین ۰ (تقویٰ والوں کے لئے سامان ہدایت ہے) تقویٰ والے کون ہیں اس کو اسی قرآن میں بتا دیا گیا ہے: الذی جاء بالصدق وصدق بہ اولٰئک ھم المتقون (جو شخص سچائی لے کر آیا اور سچائی کے سچائی ہونے کو مان کر اس کا اعتراف اس نے کر لیا ایسے ہی لوگ متقی ہیں) اور اس کے برعکس ہٹ دھرم ہیں۔ یعنی ہٹ دھرم وہ ہے جو سچی بات کو سچی بات جانتے ہوئے بھی اس کا انکار کرے اور کبھی اس کو تسلیم نہ کرے، تو جو شخص ہٹ دھرم ہوگا اس کو قرآن سے کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، وہ تو ماننے والا ہی نہیں، ہاں جو شخص سچا ہو اور سچی بات مان لیتا ہو بس وہی قرآنی ہدایات سے مستفیض ہو سکتا ہے۔

قرآن کو تین جماعتوں سے سابقہ پڑا۔ ایک جماعت متقین کی جو سچے تھے اور سچی بات مان لینے کے عادی تھے، یہی لوگ چونکہ ایسے تھے جو قرآن مجید سے فائدہ ہدایت اٹھا سکتے تھے اور قرآن درحقیقت انھیں کے لئے نازل ہوا۔ اس لئے سب سے پہلے انھیں کا ذکر کیا گیا۔ چونکہ ایسے لوگ کچھ اہل کتاب میں بھی تھے۔ اور کچھ امیوں میں بھی یعنی جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ تھی۔ اس لئے ان دونوں جماعتوں کے متقین کا ذکر یوں فرمایا گیا کہ پہلے "الذین" سے امیین کے اہل تقویٰ اور پھر "والذین" سے اہل کتاب کے اہل تقویٰ کی تصریح کرتے ہوئے دونوں جماعتوں کے متقین کے متعلق فرمایا گیا کہ

اولٰئک علی ھدی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس کے بعد ان کی ضد یعنی ہٹ دھرمیوں کا ذکر کیا یعنی دوسری جماعت جس سے قرآن کو سابقہ پڑا، وہ ان ہٹ دھرموں کی جماعت یا سن کردہ محض انکار ہی کی ٹھان لی ہے ان کو نتیجۂ کفر سے ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس جماعت اللہ بلا چون و چرا فرمایا گیا کہ

Marfat.com

فرق امیال و عواطف

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک فصیح و بلیغ، عربی زبان کا ادیب، قرآن کی فصاحت و بلاغت کی معجزانہ شان دیکھ کر اس پر ایمان لے آئے، ایک حکیم اس کی تعلیم حکمت و تزکیہ نفس کا اعجاز سمجھ لینے کے بعد اس کی لازمیت کا اعتراف کرلے، ایک قانون داں اس کے قانونی ہدایات کی معجز نما استواریوں کو دیکھ کر بے ختیار کہہ اٹھے کہ ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ مگر ایک عامی جو کسی فن، کسی علم میں کوئی دستگاہ نہیں رکھتا ہے۔ اس کتاب کے اعجاز کو کس طرح محسوس کرے گا؟ خصوصًا جب یہ کتاب اس کو بھی مجبور کررہی ہے کہ تم مجھ کو معجز مانو۔

فرق ادوار و عہود

یہ بھی بخوبی ممکن ہے کہ مختلف زمانوں میں اختلاف ماحول کی وجہ سے یا اختلاف عواطف ہی کے باعث اُن تمام وجوہ اعجاز میں سے ایک ہی دو وجہ لوگوں کے سامنے ہو، اور اس وقت تک دوسرے وجوہ پر لوگوں کی نظریں نہیں پڑی ہوں، یا پڑی ہوں مگر اچٹتی سی، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے دوروں میں وہ وجہ پیدا ہی نہ ہوئی ہو، اور بعض دور میں وہ وجہ اپنے ابتدائی مراحل میں ہو، اور اپنی عدم تکمیل کی وجہ سے اس وقت تک اعجاز کا ثبوت نہ سمجھی جاسکتی ہو۔

غرض قرآن کا اصل اعجاز اس کی لاریبیت ہے، چاہے جو شخص یا جماعت یا جس دور یا جس زمانے کے لوگ جس وجہ سے بھی اس کی لاریبیت کا اعتراف کریں۔ اعتراف کے وجوہ و اسباب میں فرق ہوگا۔ اور ضرور ہوگا مگر اعتراف لاریبیت ہر زمانے اور ہر دور میں ہر جماعت اور ہر شخص کے لئے یکساں ہی رہے گا۔ عہد نبوی سے لے کر خلافت بنی عباس کے ابتدائی دور تک تو قرآن مبین کا کھلا ہوا اعجاز عمومًا اس کی فصاحت و بلاغت ہی سمجھی جاتی رہی۔ مؤمنین اس کی حکمت و موعظت کی دل کشی اور اس کے آئین و قوانین کی استواری و ہمواری کو بھی ضرور سمجھتے تھے مگر منکروں اور ہٹ دھرموں کے سامنے اس کے معجزانہ انداز بیان اور اس کی فصاحت و بلاغت ہی کو وہ پیش کرتے رہے۔ چونکہ یہ ایک ایسی چیز تھی کہ کوئی کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، اگر وہ عربی ادب سے باخبر ہے تو اس کو قرآن مبین کی اس آفتاب سے زیادہ روشن صفت کے آگے سرنگوں ہو جانا ہی پڑتا تھا اور آج بھی سرنگوں ہو جانا ہی پڑتا ہے۔ مصر و بیروت اور عراق کے اکثر اطراف میں یہود و نصاریٰ ماہرین ادب عربی ہیں، یورپ کے علماء مستشرقین میں جن کو ادب عربی کی اچھی مہارت حاصل ہے۔ آج بھی ان کا ہر فرد قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا معترف ہے۔ زبان سے وہ اس کی فصاحت و بلاغت کو بحد اعجاز نہ مانے اور اس کے اعجاز کا اعتراف و اقرار نہ کرے مگر ہر ایک کا دل ضرور اس کی شہادت دیتا ہے اور بعض وقت ان کی زبان و قلم سے بھی اشارۃً ہی سہی مگر اس کا اظہار ہو جاتا ہے۔

مگر جیسے جیسے دنیا میں علوم و فنون کی ترقی ہوتی گئی، اس کتاب کے اور دوسرے وجوہ اعجاز بھی اہل نظر کے سامنے آتے گئے، لیکن چونکہ اس کے معجزانہ انداز بیان، اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا غلغلہ عہد نبوی سے بلند چلا آرہا ہے اور ہر زمانے میں بلند رہا اور اس کے طرز بیان، حتیٰ کہ تناسب الفاظ و حسن ادا و مترنمانہ تلفظ میں ایسی معجز نما دل کشی ہے کہ عربی سمجھنے والے ہی نہیں، بلکہ اگر کوئی خوش آواز قاری اس کی کچھ آیتیں پڑھتا ہے تو جو شخص ایک حرف بھی عربی نہیں جانتا، وہ بھی سن کر جھومنے لگتا ہے۔ اور میرا یہ ذاتی مشاہدہ ہے کہ رونے لگتا ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ اس کتاب کے دوسرے وجوہ اعجاز بھی اہل نظر کے سامنے آگئے تھے

اس کی فصاحت وبلاغت کے نقار خانے میں ان طوطیوں کے چہچہے کی طرف زیادہ کان نہیں دیئے گئے اور اہلِ نظر نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی، کہ خواہ مخواہ دوسرے وجوہ کو بھی نمایاں کرکے ان کا بھی نقارہ پیٹا جائے۔ غرض جب اعجاز قرآن کے ثابت ہونے سے اور وہ ساری دنیا پر ایک وجہ کے اعتبار سے مسلم ہو چکا ہے، تو پھر دوسرے وجوہ کو پیش کرکے منکروں کے سامنے ایک نیا موضوع بحث کیوں چھیڑا جائے۔

موجودہ زمانہ اس زمانے میں دنیا کی اکثریت عربی زبان اور اس کے ادب سے بالکل بے بہرہ ہے۔ یہاں تک کہ عربی ملکوں بلکہ مکہ اور مدینے میں بھی اب عام لوگوں کی زبان وہ قرآنی عربی نہ رہی۔ ادب عربی پر مصر و بیروت و دمشق وغیرہ میں عیسائی عرب نے وہ اثر ڈالا ہے کہ جدید عربی میں فصاحت وبلاغت کا معیار بھی بدلا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے نئے پودوں کی خود نمائی و خود فروشی اور اغیار پرستی ہر جگہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مسلم نوجوانانِ عرب بھی عیسائی عربی ادیبوں کے ساتھ ساتھ قرآنی عربی ادب اور طرز نگارش کو چھوڑ کر جدید رنگ جو عیسائی عربوں کا پیدا کردہ ہے اسی کو اختیار کرتے جا رہے ہیں، اسی لئے قرآنی فصاحت وبلاغت سے وہ ناآشنا سے ہوتے جا رہے ہیں۔ اور دور پڑتے جا رہے ہیں۔ اور عرب کے عوام تو قرآنی عربی سے اس قدر دور پڑ گئے ہیں کہ اب انہیں لفظی ترجمہ سمجھنا بھی مشکل سا ہو گیا ہے۔ تو پھر وہ فصاحت وبلاغت کو کیا سمجھیں گے۔ مدارس عربیہ میں ادب عربی کی تعلیم جہاں بھی ہے وہاں معلمین اور طلبہ کو جتنی دلچسپی مقامات بدیع و حریری و زمخشری سے یا سبعہ معلقہ و حماسہ و دیوان متنبی و ابی العتاہیہ سے ہے اتنی دلچسپی بھی انہیں قرآن مبین سے نہیں۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ علماء عرب بھی تدبر فی القرآن کی توفیق سے محروم ہی نظر آتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ جو حضرات قرآن پر نگاہ غور بھی ڈالتے ہیں تو یورپ کی عینک لگا کر۔ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یورپ کے فلسفے اور سائنس کی تحقیقات کو قرآنی آیات سے ثابت کیا جائے اور اس طرح قرآن کا ایک نیا اعجاز دنیا کو دکھایا جائے کہ دیکھو جو نئے ایجادات آج یورپ نے نکالے ہیں آج سے پونے چودہ سو برس پہلے قرآن مبین ان کی طرف اشارے کر چکا ہے۔ اور فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں تحقیق جدید اس طرح قرآن مبین کی فلاں فلاں آیتوں سے صاف اور واضح طور سے نکل رہی ہے۔

وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ دماغ سوزی نہ قرآن کے لئے مفید، نہ اسلام کے لئے۔ عوام مسلمانوں کے لئے محض دل خوش کن ہو تو ہو مگر قرآن اور اسلام کی تبلیغی اسپرٹ کے لئے سخت مضر، اور اہلِ نظر، حکمائے اسلام کے لئے شرمندگی کا باعث ہے۔ اس لئے کہ ان کی ان لفاظیوں کو دیکھ کر اہلِ یورپ یہ کہہ سکتے ہیں بلکہ کہتے ہوں گے کہ تمہاری کتاب میں یہ فلسفہ و سائنس پہلے سے موجود تھا۔ ان تحقیقات اور ان ایجادات کے متعلق قبل سے اشارے موجود تھے مگر تمہیں اور تمہارے اسلاف کو کبھی نہ سوجھے۔ باوجود اس کے کہ تمہارے ہر طبقہ کے لوگ ہمیشہ اس کتاب کو پڑھتے پڑھاتے رہے۔ تلاوت و حفظ میں سرگرم رہے مگر یہ حقائق کبھی کسی کو نظر نہ آئے۔ اور ہم لوگ بغیر آپ کی کتاب کو پڑھے خود بخود ان حقائق کو جان گئے اور اس فلسفہ و سائنس سے واقف ہی نہیں ہوئے، بلکہ ان میں ماہر ہو گئے۔ اس لئے آپ لوگوں کو اس کتاب کی ضرورت ہو تو ہو۔ ہم لوگوں کو تو اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ بلکہ آپ لوگوں کے لئے بھی یہ کتاب بیکار ہی ہے اس لئے کہ آپ کو بھی جو ہمارے ایجادات

Marfat.com

اور ہمارے بتائے ہوئے فلسفے اور سائنس اس کتاب میں نظر آنے لگے تو ہمارے ایجاد و اختراع کے بعد اور ہماری تصنیفات کو پڑھ کر۔ اور اس پر بھی آپ ابھی تک ہم سے پڑھنے اور سیکھنے کے بعد بھی اپنی کتاب کی مدد سے کوئی نئی چیز نہیں نکال سکتے بلکہ ہماری چیزوں کی نقل تک نہیں اتار سکتے۔ کیا ہمارے منکرین کے پاس اس کا کوئی جواب ہے۔

مرحوم علامہ طنطاوی نے جو ایک عمر گزار کر اتنی لمبی چوڑی تفسیر لکھی اور قرآن مبین کو ایک بساط بنا کر اس پر یورپ کے فلسفے اور سائنس کے جواہر ریزے لا لاکر بکھیر کر رکھ دیئے ہیں، ان کا مطالعہ اہل یورپ کے لئے تحصیل حاصل ہے اور مسلمانوں کے لئے سعی لاحاصل ہے۔ اس لئے کہ اس تفسیر کو پڑھ کر کوئی شخص نہ قرآن مبین ہی کو صحیح طور سے سمجھ سکتا ہے نہ فلسفہ و سائنس ہی کا ماہر ہو سکتا ہے۔ جتنا وقت ایک پڑھنے والا اس تفسیر کی ضخیم ضخیم متعدد جلدوں میں صرف کر کے بے ترتیب اور منتشر مضامین فلسفہ و سائنس کے معلوم کر سکے گا اس سے کہیں کم وقت میں ابواب و فصول کے ماتحت مرتب مضامین کسی فلسفے یا سائنس کی کتاب کو دیکھ کر ذہن نشین کر لے سکتا ہے۔ غرض اس تفسیر سے فلسفہ و سائنس کے محض سطحی معلومات وہ بھی بالکل منتشر معلوم ہو سکتے ہیں کوئی ایک فلسفہ بھی اپنے سارے جزئیات مسائل کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ نفس تفسیر کے متعلق کوئی نئی بات دوسری تفسیروں سے فاضل معلوم ہو سکتی جس کو فلسفہ و سائنس دیکھنا ہو گا وہ فلسفہ و سائنس کی کتابیں دیکھے گا نہ کہ تفسیر طنطاوی۔ اور جس کو ادب عربی کے اعتبار سے نفس تفسیر دیکھنا ہو گا تو وہ زمخشری کی کشاف دیکھے گا جس کو فقہا کے اختلافات و دلائل کی تصریحات چاہئیں وہ تفسیر کبیر وغیرہ سے کام نکال لے گا۔

کاش علامہ طنطاوی اور ان جیسے دوسرے مصنفین و مفکرین، یورپ کی بساط پر قرآنی جواہرات بکھیر کر یورپ کے بازار میں وہاں کے اہل نظر کے سامنے پیش فرماتے اور انھیں قرآنی و اسلامی جواہرات سے آشنا کرتے تو یہ اہل یورپ کے لئے بھی مفید ہوتا اور اس کا تبلیغی مقصد بھی پورا ہوتا اور قرآن و اسلام دونوں کی خدمات کا حق بھی ادا ہوتا۔

Marfat.com

افسوس کہ راویانِ احادیث تفسیر میں جو لوگ زیادہ پیش پیش تھے تقریباً سب کے سب ناقابل اعتبار اور اس جماعت میں وضاعین وکذابین کی بہت بڑی اکثریت کارفرما رہی۔ مفسرین متقدمین نے ہر آیت کے متعلق متضاد و متخالف روایتیں جھوٹی سچی ہر طرح کی حدیثیں اور ہر طرح کے اقوال جمع کرکے آیات قرآنیہ کے معانی کو مشتبہ کر دیا کہ پڑھنے والوں کو پتہ نہ ملے کہ قرآن کا اصل اور صحیح مطلب کیا ہے۔ بلکہ ہر شخص اپنی رائے کے مطابق جو حدیث جو قول دیکھے اسی کے مفہوم کو صحیح معنیٰ قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرے۔

جب فرقہ بندیوں کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں تو پھر ہر فرقے نے اپنے فرقہ وارانہ مسلک کی پشتیبانی کے لئے تفسیریں لکھنا شروع کیں اور قرآن کو اپنی مخصوص فرقہ وارانہ ذہنیت کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن جیسی آسان اور سریع الفہم کتاب دشوار فہم بن کر رہ گئی اور موجودہ مفسرین ومفکرین قرآن کے حریم کعبہ میں یورپ کا ناقوس بجانے کی دھن میں لگے ہیں۔

بعض نئے مفکرین موجودہ سیاسی کشمکش میں قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر کے اپنا مطلب نکال رہے ہیں۔ غرض جو ہے وہ قرآن کو اپنی طرف کھینچتا ہے، خود قرآن کی طرف نہیں کھنچتا قرآنی آیات کو اپنی طرف لانے کی جدوجہد کرتا ہے، خود قرآن کی طرف نہیں جاتا۔

غرض ان اگلی اور پچھلی تفسیروں کے غبار میں قرآن مبین کی لاریبیت کا آفتاب اس طرح چھپ گیا ہے کہ بس اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ دن کا وقت ہے مگر یہ پتہ نہیں ملتا کہ ظہر کا وقت ابھی باقی ہے یا عصر کا وقت شروع ہوگیا۔ فصاحت وبلاغت کے بحرِ اعجاز ہونے کے غلغلے لوگوں کے کان کھر چکے ہیں، اور یہ غلغلہ بھی ایک حد تک مدھم پڑچکا ہے اور مدھم پڑتا ہی جارہا ہے چونکہ اب اس دعوے کے جانچنے والے اور علیٰ وجہ البصیرۃ اس کو صحیح سمجھنے والے غالباً ہزار میں ایک سے زیادہ نہ ملیں گے۔ بعض پرانے خیال کے لوگ قرآن کی فصاحت وبلاغت کو محض عقیدۃً معجزہ مان رہے ہیں، ورنہ بعض لوگ تو بول جاتے ہیں کہ سعدی کی گلستاں اور فردوسی کے شاہنامے کا بھی تو کسی سے جواب آج تک نہ ہوسکا۔ حالانکہ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ سعدی یا فردوسی نے اپنے اپنے وقت کے اہل قلم کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ اگر سعدی چیلنج کرتے تو اس وقت ایسی ایسی کتنی گلستاں تیار ہوجاتیں اور اگر فردوسی چیلنج کرتے تو متعدد شاہنامے تیار ہوجاتے جس بلند آہنگی کے ساتھ قرآن مبین نے مخالفوں اور منکروں کو مقابلے کے لئے للکارا ہے اور غیرت دلائی ہے۔ اور پھر یہ بھی پہلے ہی کہہ دیا کہ تم کبھی مقابلے میں نہیں آسکتے۔ اس کی کوئی مثال تحدی اور چیلنج کی دنیا میں نہیں مل سکتی۔ یہ اللہ کے کلام ہی کی شان ہے جو اتنا بڑا چیلنج ساری دنیا کو دے اور چیلنج کے ساتھ ساتھ یہ پیشین گوئی بھی کردے کہ ساری دنیا بھی اگر چاہے کہ

Marfat.com

ب کے سب مل کر اس چیلنج کو قبول کرلیں اور مقابلے کے میدان میں آجائیں تو کبھی نہ آسکیں گے۔ دنیا کے کسی انسان میں یہ ہمت نہیں کہ یسا اور اتنا زبردست چیلنج ساری دنیا کو للکار کر دے۔

وقت کا تقاضا مذکورہ وجوہ کی بنیاد پر وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت دوسرے وجوہ اعجاز جو عوام تو عوام ہیں، اہلِ نظر کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہو رہے ہیں، ان کو دنیا کے سامنے پیش کردیا جائے، خصوصاً وہ وجہ اعجاز جو مرورِ ایام کے بعد پیدا ہوئی، اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، یہ نمایاں ہوتی گئی اور نمایاں تر ہوتی جاتی ہے، اس طرح کے گویا ہر ایک کے پیش نظر ہے۔ لیکن دنیا کی کم نظری کی وجہ سے بزبانِ حال کہہ رہی ہے کہ

از غایت ظہور نشانم پدید نیست

یہ وجۂ اعجاز گو مرورِ ایام کے بعد پیدا ہوئی مگر اس کی تخم ریزی عہد نبوی میں آغاز نزول ہی کے وقت ہوگئی تھی اور برابر قدرت الہیہ کے غیبی ہاتھوں سے اس کی پرورش و پرداخت ہوتی رہی۔ کام کرنے والے ہاتھ بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تھے مگر ان کے مبارک ہاتھ محض آلے اور اوزار تھے۔ یہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ہم سے کتنا بڑا کام لیا جا رہا ہے۔ یہ اپنا ایک فرض انجام دے رہے تھے۔ یہ نہیں سمجھتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے کہ قرآن کی یہ خدمت جو ان کے ہاتھوں سے انجام دلائی جا رہی ہے آئندہ چل کر آخر زمانے میں قرآن کا ایک زبردست معجزہ ثابت ہو کر رہے گی۔

ضرورت تو یہ ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والے اہلِ علم و اہلِ قلم قرآن مبین کی سیاسی تعلیم، معاشرتی تعلیم، اقتصادی تعلیم، تمدنی تعلیم، قانونی تعلیم اور نفسیاتی تعلیم وغیرہ، ہر ایک کی معجزانہ شان کو اجاگر کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیں۔ یہ کام ایسا نہیں جس کو ایک شخص پوری طرح انجام دے سکے۔ اگر میری زندگی نے وفا کی اور توفیقِ الٰہی نے میری مدد فرمائی تو ان موضوعوں پر بھی اپنی بضاعت علمی کے مطابق کچھ لکھوں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ورنہ

شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

اس وقت مصلحتِ وقت یہ ہے کہ سب سے پہلے میں قرآن مجید کے ایسے معجزے کو دنیا کے سامنے پیش کردوں جو قرآن کا اصل دعویٰ ہے جس دعوے کو منوانے کے لئے قرآن نے ساری دنیا کو چیلنج کیا، جس دعوے کو مختلف زبانوں میں مختلف حیثیتوں سے دنیا والوں نے تسلیم کیا، جن کی زبان ہٹ دھرمی کی وجہ سے اعتراف و تسلیم نہ کرسکی، ان کے دل نے ضرور تسلیم کرلیا۔

آج میں قرآن کے اس دعوے کا ثبوت اس کی ایسی نمایاں وجۂ اعجاز کے ذریعے پیش کر رہا ہوں کہ اس کے معلوم کرلینے کے بعد کوئی عقل و ہوش والا انسان، اگر کچھ بھی صداقت اور دیانت رکھتا ہے، ہٹ دھرم نہیں ہے تو اس کو قرآن کے اعجاز کا اعتراف کرنا پڑیگا۔

اللہ کے دعوے اور اللہ کے وعدے اللہ تعالیٰ نے قرآن مبین کے متعلق دو بہت اہم دعوے فرمائے۔ پہلا دعویٰ بہت زیادہ اہم ہے اس لئے اس کو بڑے زوردار طریقے سے پیش کیا اور اس کی دلیل میں چیلنج کا ایک پہاڑ منکرین کے سامنے لاکر رکھدیا۔ وہ **پہلا دعویٰ** تو یہ ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ یہ کتاب اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

Marfat.com

دوسرا دعویٰ: لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۔ باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، یہ ایک بڑی حکمت والے مستحقِ ہمہ ستائش کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے۔

اور وعدے

سب سے اہم اور زبردست وعدۂ الٰہی تو قرآن کی حفاظت کا ہے۔ فرمایا گیا

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

ہم نے اس نصیحت والی کتاب کو اتارا ہے اور ہمیں اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔

دوسرا اہم ترین وعدہ جو کئی وعدوں پر مشتمل ہے یوں فرمایا گیا:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ [1]

میرے ہی ذمے اس کتاب کو جمع کرا دینا اور پڑھوا دینا ہے

چونکہ یہ کتاب بیک دفعہ پوری کی پوری تعلیم و تبلیغ کے لئے نہیں اتری بلکہ اس کی آیتیں تھوڑی تھوڑی کرکے اتریں، اس لئے ان منتشر آیتوں کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ جمع کرا دینا اور اس پر ایمان لانے والوں سے اس کا پڑھوا دینا آسان کام نہ تھا تو فرمایا جاتا ہے کہ یہ کام ہمارا ہے اس کو جمع بھی کرادیں گے اور لوگوں سے پڑھوا بھی دینگے۔ اس کے بعد وعدہ فرمایا جاتا ہے کہ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ یعنی ہم نے جو تبیین قرآن کی خدمت تمہارے سپرد کی ہے۔ لِتُبَيِّنَ لَهُمْ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ تاکہ لوگوں کی طرف جو کچھ اتارا گیا ہے تم اس کو ان کے سامنے واضح طور سے بیان کردو تو تم سے اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔

دعوے اور وعدے تو اور بھی ہیں جن میں سے بعض اہم دعووں اور وعدوں کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔ اس وقت مذکورہ بالا دعووں اور دونوں وعدوں کو پیش کرکے ان پر سب سے مجھے بحث کرنا ہے مگر وعدے تو ہمیشہ آئندہ کے لئے ہوا کرتے ہیں، اور ان کا زمانہ حال سے زمانۂ مستقبل کی لامعلوم مدت تک طول کھینچا ہوا ہوتا ہے، اس لئے دعویٰ عقلاً وعدوں پر تقدم اہمیت رکھتا ہے۔ اسی بنا پر میں سب سے پہلے اسی دعوے کو پیش کرتا ہوں جس کو خود اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیش فرمایا ہے یعنی

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ

یہ کتاب، اس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔

لاریبیت

جن جن چیزوں میں لاریبیت کی صفت پائی جاتی ہے اور آپ ان کو لاریب فیہ سمجھتے ہیں۔ ان پر غور فرمائیے۔ آپ یا تو حواس خمسہ کے ذریعہ ان کو محسوس کرکے ان کے متعلق یقین حاصل کرلیتے، اس کے بعد اس کو لاریب فیہ سمجھتے ہیں یا کسی محسوس کی ہوئی چیز پر قیاس کرکے یقین حاصل کرلیتے ہیں اور کسی چیز کو لاریب فیہ مانتے ہیں۔ مگر چکھنے کی چیز کا صحیح مزا آپ چکھ ہی کر لاریب فیہ کی حد تک جان سکتے ہیں۔ صرف دیکھ کر یا سونگھ کر آپ کو اس کے مزے کے متعلق وہ قطعیت علم حاصل نہیں ہوسکتی

---

[1] پہلے جمع کا ذکر فرمایا اس کے بعد "قرآن" یعنی پڑھوا دینے کا جس سے صاف ظاہر ہے کہ جمع قرآن حسب منشاء الٰہی کا کام آغاز نزول ہی کے وقت سے شروع ہوگیا تھا کیونکہ جب تک آیات مجتمع نہ ہوں سورتوں کا پڑھنا ہی ناممکن تھا ۱۲ منہ غفرلہ

جو چکھ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھے گویّے کی خوش لحنی و خوش نوائی کو آپ صرف اُس کے لبوں کی حرکت اور تان لیتے وقت منہ چیرنے اور گردن کی رگوں کے پُھلانے کو دیکھ کر لاریبیت کی حد تک کبھی نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ اس کی خوشنوائی اپنے کانوں سے سُن نہ لیں۔ وغیر ذلک۔ غرض جس حاسّے جس قوت ادراک سے جس چیز کی جس صفت کو محسوس اور دریافت کرسکتے ہیں، جب تک اسی حاسّے اور اسی قوت ادراک سے اس چیز کی اس صفت کو آپ محسوس و دریافت نہ کرلیں اس وقت تک اس چیز کو اس صفت کے ساتھ اس حد تک کبھی موصوف نہیں سمجھ سکتے کہ اس کے اس اتصاف کو آپ لاریب فیہ کہہ سکیں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ وہ چیز آپ کے سامنے موجود ہو، یا موجود ہو سکے، یا آپ اس تک خود پہنچ سکیں۔ جو چیز نہ آپ کے سامنے موجود ہو سکے نہ آپ اس تک پہنچ سکیں، ایسی چیز کی لاریبیت آپ کو صرف ایک ہی ذریعہ سے پوری طرح حاصل ہو سکتی ہے اور وہ ذریعہ صرف تواتر خبر ہے۔ چاہے وہ چیز زمانۂ موجودہ کی ہو، مگر آپ کی دسترس سے باہر ہو۔ چاہے وہ چیز زمانۂ گذشتہ کی ہو اور زمانۂ موجودہ میں اس کی صرف داستان رہ گئی ہو اور کچھ آثار باقی نہ ہوں۔ یا وہ اصل شئے تو علیٰ حالہٖ موجود ہو مگر اس کے متعلق کچھ باتیں کہی جاتی ہوں تو ان کا یقین بحد لاریبیت صرف تواتر ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اگر اس تواتر کے ساتھ ساتھ دوسرے دلائل بھی ہوں، قرائن بھی ہوں تو کیا کہنا ہے اور اگر اس تواتر خبر کے ساتھ عملی تواتر بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے اگر اس بات کا تعلق عمل سے بھی ہے۔

غرض موجودہ زمانے کی محسوس چیزوں کا یقین بحدِ لاریبیت حواس خمسہ میں سے جس حاسّے سے اس چیز کا تعلق ہے اسی حاسّے کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور گذشتہ زمانے کی کسی چیز کے متعلق علم الیقین بحد لاریبیت صرف تواتر ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے تواتر نہ ہو تو فقط قرائن و دلائل سے بھی ہوتا ہے مگر ممکن ہے کہ اس قدر نہ ہو۔

عہد نبوی میں تو رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے قرآنی آیات سن کر اس کے معنی مطلب سمجھ کر اہل عرب جو اس کے پہلے مخاطب تھے اس کی فصاحت و بلاغت، اس کے نصائح و مواعظ کے نفوذ فی القلوب اور اس کے اسلوب بیان کی دلکشی، پھر اس کی تحدی کے زوردار اعلانات کو سُن سُن کر اس کی لاریبیت کے معترف ہو جاتے تھے۔ اہل تقویٰ و اہل صداقت ایمان لے آتے تھے اور ہٹ دھرم گو دل ضرور مان لیتے تھے جس کا ثبوت تحدی اور چیلنج سن کر بھی ان کے مقابلے کے لئے نہ آنے سے مل رہا تھا۔ بعد والوں کے لئے تو پھر لوگوں سے تواتر کے ساتھ سنتے رہنا ہی ایک ذریعہ رہ گیا اس کی لاریبیت پر یقین لانے کا۔ اور اس تواتر کے ساتھ ساتھ اس کی تحدی جو قیامت تک کیلئے ہے۔ اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کو لاریب فیہ ثابت کر رہی ہے۔

تواتر کی تعریف

تواتر خبر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ آپ کوئی خبر بار بار اتنے لوگوں سے سُنیں کہ عقل اس کو تسلیم نہ کرے کہ اتنی بڑی جماعت اور اتنے لوگ خلاف واقعہ ایک غلط بات بلا وجہ ہم سے اور دوسروں سے متفق اللفظ ہو کر بیان کرینگے۔

ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی ایک خیال کی یا ایک غرض کی ایک بڑی جماعت اپنی کسی غرض کے ماتحت باہم مشورہ کرکے ایک بالکل جھوٹی بات جی سے گھڑ کر اس طرح متفق اللفظ ہو کر متفرق جگہ جا جا کر بیان کرے اور اپنے ساتھ چند دوسری جماعت کے بھی سیدھے سادے لوگوں کے کان بھر کر ان کے ذریعے بھی اور بعض لالچی عیاروں کو کچھ دے کر ان سے بھی اس خلاف واقعہ بات کا اس طرح پروپگنڈہ

شہر بشہر کرائے کہ عام سامعین کو اس خبر کے متواتر ہونے کا گمان ہونے لگے اور کچھ دنوں کے بعد یہ جھوٹا پروپاگنڈا ایک نہایت سچی اور متواتر خبر ہر خاص و عام میں سمجھی جانے لگے۔ اس کی مثالیں بہت ہیں اس لئے خبر متواتر کی ابتدائے تواتر اور ابتدائے اشتہار کی نوعیت اور اس کے اشتہار کا منشا، مشتہرین کی غرض، اس خبر سے مشتہرین کے کسی مفاد خصوصی و پوشیدہ کے تعلق کا پتا لگا لینا ضروری ہے۔ پھر تواتر کا خود بخود پیدا ہو جانا اور تواتر کا پیدا کرنا، دونوں کا فرق بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تواتر کا آغاز جہاں کا واقعہ ہے وہاں سے شروع ہوا ہے یا کسی دوسری جگہ سے یہ سب باتیں تواتر میں قابلِ غور ہیں۔ مثلاً واقعہ تو مدینہ کا ہو، مگر تواتر کا آغاز ہوا ہو کوفے اور بصرے سے۔ یا واقعہ ہو سنہ ۱۲ھ کا اور تواتر کا سرچشمہ دوسری صدی ہجری سے پھوٹے۔ اس قسم کے تواتر یقیناً کسی خلاف واقعہ ہی بات کے پھیلانے کے لئے بزور قائم کئے جاتے ہیں۔ ورنہ قصۂ سرزمین برسرزمین کے مطابق جہاں کا واقعہ ہے وہیں سے تواتر خبر کا آغاز ہونا چاہئے اور جس زمانے کا واقعہ ہو اسی زمانے میں اس کی شہرت سرزمین واقعہ پر عام ہونی چاہئے، اور پھر وہیں سے اس خبر کو الاقرب فالاقرب کے مطابق رفتہ رفتہ دور دور پھیلنا چاہئے۔ یہ تو کوئی قابلِ وثوق بات نہیں کہ واقعہ کب کا اور اس کا چرچا شروع ہو کب، واقعہ کہاں کا اور اس کا پروپاگنڈا کیا جائے کہاں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک تواتر خبر کے خلاف دوسرا تواتر خبر پیش کیا جائے۔ ایسی صورت میں جو تواتر مقام و وقتِ وقوع کی رعایت کے ساتھ عقل و درایت کے مطابق ہوگا وہی قابلِ قبول ہوگا۔ مکمل اور بدرجۂ اتم، قابلِ قبول و موجب یقین تواتر وہی ہے جس کی خبر مختلف الخیال اور متغائر العقیدہ جماعت و افراد جن کو اصل واقعہ سے سروکار نہیں سب کو واقعے کے وقوع کا اعتراف ہو۔

ممکن ہے کہ مخالفین کو جزئیات واقعہ یا سبب واقعہ جو بیان کئے جاتے ہیں ان سے کسی قدر اختلاف ہو مگر واقعہ سے مخالفین کو بھی اختلاف نہ ہو۔ جہاں کی بات ہو وہیں سے اس کے تواتر کا سلسلہ شروع ہوا ہو، اور جس زمانے میں اس کا وقوع ہوا ہو اسی زمانے سے اس کے تواتر کی بھی ابتدا ہوئی ہو۔ جس تواتر کا سرا ہی معلوم نہ ہو کہ کب سے آغاز ہوا اور کہاں سے شروع ہوا وہ تواتر عقلاً کوئی سند کوئی حجت اپنی صحت کے لئے نہیں۔ جب تک تواتر کا مبنیٰ معلوم نہ ہو اس وقت تک اس تواتر کا کوئی اعتبار نہیں۔

تواتر کی قسمیں اور قرآن مبین

۱۔ تواتر اسنادی، یہ مرکب ہے تین تواتر سے (ل) تواتر مسند (ب) تواتر مسند الیہ (ج) تواتر اسناد۔ مثلاً حافظ شیرازی کی ذات، ان کی شہرت شاعری کے وقت سے آج تک پورے تواتر کے ساتھ علم و ادب کی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اسی طرح دیوانِ حافظ کی شہرت پورے تواتر کے ساتھ ساری دنیائے علم و ادب میں آپ دیکھ رہے ہیں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حافظ شیرازی کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ دیوانِ حافظ کوئی کتاب ہی نہیں۔ دیوان حافظ کی نسبت حافظ شیراز خواجہ شمس الدین محمد کی طرف ہے۔ خواجہ حافظ مسند الیہ ہیں اور ان کا دیوان حافظ مسند۔ اس دیوان کی نسبت جو خواجۂ حافظ کی طرف ہے وہ بھی تواتر تام کے ساتھ ہر جگہ مشہور و معروف ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دیوان کسی اور کا ہے جو حافظ شمس الدین شیرازی کی طرف غلطی سے منسوب ہو گیا ہے جس طرح لوگ دیوان مخفی کو کہتے ہیں کہ یہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی بیٹی زیب النسا کا دیوان نہیں ہے مخفی تخلص ایک درباری شاعر تھا یہ اس کا دیوان ہے جو زیب النسا کی طرف منسوب ہے۔ اسی طرح بعض لوگ کلیاتِ ظفر کے

Marfat.com

بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بہادر شاہ کا کلیات نہیں ہے بلکہ ابراہیم ذوقؔ یا کسی اور کا ہے اس طرح کا شبہ کبھی کسی نے دیوانِ حافظ کے بارے میں نہیں کیا۔ اس لئے دیوانِ حافظ کی اسناد یعنی اس کی نسبت جو خواجہ شمس الدین کی طرف ہے وہ بھی متواتر ہے (اسی طرح قرآن مبین مسند ہے، اس کا وجود قطعی اور ایسا متواتر کہ دنیا کی کسی کتاب کو بھی یہ تواتر حاصل نہیں۔ دنیا میں جتنے قلمی اور مطبوعہ قرآن مجید کے نسخے زمانہ خیر القرون یعنی پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی سے آج جو تاریخ یکم ماہ ربیع الآخر ۱۳۷۲ھ ہے اس وقت تک تقریباً پونے چودہ سو برس تک کے لکھے ہوئے اور چھپے ہوئے جتنے نسخے دنیا میں ہیں، اس کی عشر عشیر تعداد بھی کسی کتاب کی، ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہو یا چھپی ہوئی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس پونے چودہ سو برس کی طویل مدت کا کوئی دن ایسا وہم میں بھی نہیں آسکتا جس میں دنیائے اسلام میں اس کی تلاوت اس کی قرارت، اس کے حفظ، اس کی تعلیم، اس کی کتابت اور اس کی طباعت (جب سے طباعت کا عام رواج ہو گیا) کسی نہ کسی جگہ نہ ہو رہی ہو۔ اسلئے اس مسند یعنی اصل قرآن کے تواتر کا کیا پوچھنا ہے۔ باقی رہا مسند الیہ تو ساری دنیا یہ جانتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ تھا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور یہ قرآن مجھ پر اللہ کی طرف سے اترا ہے اور اسی پر تقریباً چودہ سو برس سے ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ جو غیر مسلم عہد نبویؐ سے لیکر اس وقت تک دنیا سے گذر گئے اور جو اس وقت موجود ہیں ان میں کا ہر باخبر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ قرآن وہی ہے جس کے بارے میں آج سے پونے چودہ سو برس پہلے مکے کے رہنے والے محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہاشمی قریشی کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے مجھ پر اتری ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ یہ ایک ایسی متواتر بات ہے جس کا انکار کبھی کسی زمانے میں بھی کسی نے نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کو یہ شبہ ہوا کہ محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب جو مکے کے رہنے والے تھے جن کا دعویٰ تھا کہ میں اللہ کا رسول اور نبی ہوں، جن کی رسالت اور نبوت پر دنیائے اسلام کا تقریباً چودہ سو برس سے ایمان ہے، ان کی کوئی شخصیت ہی نہ تھی، اس کا کسی کو کبھی وہم بھی نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک فرضی نام ہے یا یہ کتاب بعد کو کسی نے تصنیف کر کے ان کی طرف منسوب کر دی تھی۔ غرض قرآن جو مسند ہے وہ قطعی و متواتر، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مسند الیہ ہیں، ان کی ذات مبارک قطعی و متواتر اور قرآن کی نسبت قرآن کی اِسناد جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوئی ہے یہ اسناد قطعی و متواتر اور تینوں قسم کا تواتر اس حد تک قطعی، واضح اور مکمل ہے کہ ایسی تکمیل تواتر کی مثال کسی دوسرے مسند، کسی دوسرے مسند الیہ، اور کسی دوسری اس قسم کی اسناد میں دکھائی نہیں جا سکتی۔

(۲) **تواتر مکانی**: یعنی جو واقعہ جس بستی کا ہوتا ہے، پہلے اسی بستی میں مشہور ہوتا ہے اور اہمیت کے مطابق اس بستی کے اکثر افراد یا ہر فرد کو معلوم ہو جاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے اور اس بستی کے قرب و جوار کے لوگ بھی اس سے واقف ہو جاتے ہیں، اسی طرح اور آگے بڑھتا ہے اور پھر دور دور مشہور ہو جاتا ہے مگر جس قدر تواتر اس بستی کے افراد میں اس واقعے کے متعلق ہوتا ہے دور کے لوگوں میں نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ زیادہ دور کے لوگوں میں بہت کم لوگ اس واقعے سے باخبر ملیں گے۔ بلکہ زیادہ دور والوں میں واقعہ محض افواہ ہی کے طور پر ہو گا جس کو تواتر کہنا بھی صحیح نہ ہو گا۔

قرآن مجید کا یہ ایک خاص معجزہ ہے کہ اس کا مکانی تواتر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اتنا وسیع ہوا کہ ساری دنیا کے باخبر لوگ اس

اس کے اِسنادی تواتر کے معترف ہیں اور سب کے سب اس کی نغمہ سرائی میں ہم آہنگ، صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی۔

(۳) تواترِ زمانی: عموماً جو واقعہ جس زمانے میں ہوتا ہے اس کی اہمیت کے مطابق اس کا چرچا اسی زمانے میں زیادہ ہوتا ہے جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے، لوگ اس کو بھولتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر وہ بہت اہم واقعہ بھی ہے تو دو تین چار صدی یا اس سے کچھ زیادہ مدت کے بعد پھر وہ واقعہ محض ایک داستان ایک افسانہ ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر اس داستان کی مجموعی حیثیت کا زبانی یا کتب تواریخ میں تواتر ہو بھی تو اس کے جزئیات کی تفصیل یا تو ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو طرح طرح کے اختلافات اور اوہام کے ساتھ جن کے متعلق وہ تواتر بھی صحیح طور سے باقی نہیں رہتا اور عقل اس کی صحت میں متامل ہوتی ہے۔

مگر قرآن مجید کا معجزانہ تواتر اس کی پہلی آیت کے وقتِ نزول سے شروع ہوا تو پھر ہر آیت اور ہر سورہ کا تواتر اس کے نزول کے وقت سے روز افزوں شہرت و شیوع کے ساتھ پھیلتا اور بڑھتا ہی رہا۔ آج پونے چودہ سو برس کے بعد بھی اس کا تواتر باخبر دنیا کے ہر گوشہ میں گونج رہا ہے محض داستان و افسانہ کے طور سے نہیں بلکہ واقعۂ صادقہ و حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے جس سے دنیا کا کوئی صاحبِ علم و خبر انکار نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا تواتر اسنادی اور اس کا تواتر مکانی و زمانی خود ایک معجزہ ہے جو اس کی لاریبیت کی اوضح ترین دلیل ہے۔

(۴) تواترِ ذاتی: یعنی اصل شے اور اس کی ذات، اس کی ہیئت مجموعی اور اس کے اجزائے ترکیبی کا تواتر کہ جب سے قرآن کا نزول شروع ہوا، اس وقت سے جیسے جیسے اس کی آیتیں مرتب ہوتی گئیں اور سورتیں بنتی گئیں۔ یا پوری سورتیں اترتی گئیں اور پھر سب کو مرتب و مدون کرکے رسول اللہ صلعم نے پوری کتاب اپنی امت کو دیدی اور اس کے ایک ایک حکم کی علمی و عملی تعلیم اور ایک ایک عقیدے اور وعظ و تذکیر کی تبلیغ فرما کر اپنے مفوضہ فریضۂ رسالت سے باحسن وجوہ سبکدوشی حاصل کی اس وقت سے وہی کتاب اپنی اس ہیئت مجموعی اور اسی ترکیب اجزائی کے ساتھ اس وقت تک بالکل اسی حالت و ہیئت میں مکمل تواتر کے ساتھ ہر ملک ہر بستی اور ہر محلے کے ہر مسلمان گھر میں اباً عن جدٍ چلی آرہی ہے۔ اس کو تواتر مسند بھی کہا جا سکتا ہے جس کا بیان اوپر گذرا مگر وہاں اس کی اسنادی حیثیت دکھائی گئی تھی اور یہاں اس کی ذاتی صفتِ تواتر کو ثابت کیا گیا۔ اس لئے یہ تکرار مضمون نہیں ہے۔

(۵) تواتر اجزائی: ایک تو تواتر مجموعی ہے، یعنی پورے مجموعے کا تواتر بحیثیت اس کی ذات کے اور پھر اس کی اسناد کے، وہ دونوں تو بیان ہو چکے۔ تواتر ذاتی اور تواتر اسنادی کے زیرِ عنوان، اسلئے تواتر مجموعی کا الگ عنوان قائم نہیں کیا، کہ ایک ہی مضمون کا اعادہ بے فائدہ ہوگا۔ مگر تواتر اجزائی کے ضمن میں تواتر مجموعی کا ذکر بھی ضروری ہے تاکہ آپ تواتر اجزائی کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔

تواتر مجموعی سے میری مراد یہ ہے کہ ہر چیز کے بہت سے اجزاء ہوتے ہیں، انھیں اجزاء سے اس کی ذات مرکب ہوتی ہے اور انھیں اجزاء کے مجموعے کو آپ اس چیز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مکان کا تصور جب آپ کرتے ہیں تو اس مکان کے اجزاء یعنی دیوار، دروازے، چوکھٹ، کواڑ، کڑی، شہتیر، چھپر اور ستون سب کے مجموعے کا ایک نقشہ آپ کے سامنے آجاتا ہے۔ جب آپ کسی مکان کی نسبت کسی کی طرف کرتے ہیں کہ یہ مکان فلاں کا ہے تو یقیناً آپ اس مکان کی ہر دیوار اور دیوار کی ہر اینٹ، اس کی چوکھٹ، کواڑ، کڑی، شہتیر اور

ستون وغیرہ سب کی نسبتِ ملکیت بھی اسی شخص کی طرف قرار دیں گے کیونکہ کل کے ضمن میں اس کے اجزا بھی ہوتے ہیں۔ تو آپ دیوان حافظ کی نسبت جو خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کی طرف کرتے ہیں تو اس ضمن میں اس دیوان کے ہر قصیدے، ہر غزل بلکہ ہر شعر اور ہر شعر کے ہر لفظ کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مگر یہ ہر قصیدے، ہر غزل، ہر شعر اور ہر شعر کے ہر لفظ کی نسبت جو خواجہ حافظ کی طرف آپ سمجھتے ہیں تو یہ اس پورے دیوان کے ضمن میں سمجھتے ہیں اسلئے یہ ضمنی نسبت اتنی یقینی اور قطعی نہیں ہو سکتی، جتنی پورے مجموعے کی نسبت قطعی اور یقینی ہے۔ چنانچہ دیوانِ حافظ کے بعض قصیدے کو اکثر محققین الحاقی کہتے ہیں اور بعض غزلوں اور شعروں کو بھی چنانچہ بعض قدیم نسخوں میں وہ قصیدے، وہ غزلیں اور وہ اشعار نہیں ملتے ہیں اس لئے ان الحاقی قصیدوں، غزلوں اور شعروں کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف یقینی و قطعی طور سے صحیح نہیں سمجھی جاسکتی یہانتک کہ حافظ کی پہلی غزل کا مقطع

حضوری گرہمے خواہی، ازو غائب مشو حافظ
متی ما تلق من تھوی دع الدنیا و اھملھا

اگر کوئی شخص کہے کہ اس مقطع کا دوسرا مصرع اس طرح حافظ شیرازی نے نہیں کہا تھا ہم نے ایران کے شاہی کتب خانے میں خواجہ حافظ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کا دیوان دیکھا ہے جس میں انھوں نے اس مقطع کے دوسرے مصرع کو یوں لکھا ہے: دع الدنیا متی ما تلق من تھوی و اھملھا۔ تو آپ یقیناً فوراً مان لیں گے اور یقین کر لیں گے کہ خواجہ حافظ نے ضرور اسی طرح لکھا ہوگا بعد والوں نے نقل کرنے میں غلطی کی کیونکہ متی ما کے ماتحت جو شرط آئے اس کی جزا میں "ف" کا آنا ضروری ہے ہاں اگر جزا مقدم آجائے تو پھر "ف" نہیں آسکتی یعنی متی ما تلق من تھوی فدع الدنیا کہنا چاہئے تھا۔ مگر اس طرح مصرع موزوں نہیں ہوتا اور اگر دع الدنیا متی ما تلق من تھوی و اھملھا کہئے تو وہ نحوی غلطی نکل جاتی ہے اور مصرع بھی موزوں ہو جاتا ہے۔ اس لئے آپ کا یہ سمجھ لینا کہ عام طور سے یہ مقطع جس طرح ہر دیوان قلمی و مطبوعہ میں نظر آتا ہے غلط ہے حافظ شیرازی نے اس طرح نہیں کہا ہوگا اور یہ شخص جو ایران سے شاہی کتب خانے میں خواجہ حافظ کے دست خاص کے لکھے ہوئے دیوان کو دیکھ کر آیا ہے اور اس میں دیکھ کر جو کہہ رہا ہے وہی صحیح ہے اور اسی کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف صحیح ہے اور عام نسخوں میں جس طرح ہے اس کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف صحیح نہیں۔ یہاں تو ایک نحوی غلطی بھی آپ کو یہ سمجھنے پر مجبور کریگی، اگر نحوی غلطی نہ ہو جب بھی دوسروں کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے اور مطبوعہ نسخوں سے اور خاص مصنف کے یا اس کے کسی شاگرد رشید یا خلف الصدق کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے میں کچھ فرق ہو تو ہر شخص خاص مصنف یا اس کے شاگرد یا بیٹے کے لکھے ہوئے نسخے کو دوسروں کے لکھے ہوئے نسخوں سے زیادہ صحیح ماننے پر مجبور ہوگا اس لئے کہ تواتر پورے مجموعے کی نسبت کا ضرور ہے مگر اس کے ہر جزء کا تواتر اسناد، اس کے مسند الیہ کی طرف مستقل طور سے نہیں ہے۔ اگر ہے تو پورے مجموعے کے ضمن میں ہے۔

مگر قرآن مجید کا تواتر اسنادی کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے بارے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعوی تھا کہ یہ کتاب ان پر اللہ تعالی کی طرف سے اتری ہے جس طرح پورے مجموعے کے متعلق ہے بالکل اسی طرح اس کے ہر سورے ہر آیت، ہر جملے اور ہر جملے

Marfat.com

کے ہر لفظ، بلکہ ہر حرف یہاں تک کہ ہر حرکت و سکون اور ہر نقطے کے متعلق ہے اس لئے کہ اس مجموعے سے پہلے اس کے اجزا ہی کا تواتر شروع ہوا۔ جیسے جیسے آیتیں اترتی گئیں لوگ سنتے گئے، سیکھتے گئے، پڑھتے گئے، یاد کرتے گئے اور لکھتے گئے، پھر دوسروں کو پڑھاتے گئے۔ جس کا سلسلہ ہر مسلم گھر میں پورے چودہ سو برس سے آج تک چلا آرہا ہے۔ پھر جیسے جیسے اس کے اجزا باہم ملتے گئے، ان چند اجزاء کے مجموعے کے بھی ہر جستہ تواتر کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پورا سورہ مرتب ہوگیا تو اب پورے سورے کا تواتر شروع ہوگیا۔ تواتر اجزائی کی ایسی مکمل مثال جب سے دنیا بنی اس وقت سے اس وقت تک دنیا نہیں دکھا سکتی، نہ قیامت تک اس کی کوئی مثال دکھا سکتی ہے، اس کو کہتے ہیں زندہ معجزہ قرآن مبین میں خود فرمایا گیا ہے۔

وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ کذلک لنثبت بہ فؤادک ورتلنٰہ ترتیلا (   )

اور کافروں نے کہا کہ ان پر پورا قرآن ایک مرتبہ کیوں نہیں اتار دیا گیا؟ ایسا ہی ہوا یعنی غار حرا میں پورا[1] قرآن ایک بار آنحضرت صلعم پر اتر چکا ہے مگر یہ جو تھوڑا تھوڑا اتر رہا ہے) اسلئے کہ اس کے ذریعے تمہارے دل کو ہم تقویت پہنچائیں۔ تمہارے دل میں اس کو ثابت و جاگزیں کرکے اور ہم نے اس کو ٹھہراؤ اور ایک نظم و ترتیب کے ماتحت رکھا ہے۔

یعنی اگر پورا قرآن ایک بار تعلیم و تبلیغ کے لئے اتر جاتا تو صحابہؓ نہ اس کو یاد کر سکتے، نہ اس کے مضامین پر پوری طرح حاوی ہو سکتے، اور نہ اس کے ہر ہر جزء کا تواتر قائم ہو سکتا۔ اسلئے ممکن تھا کہ اس کے بعض اجزاء کے متعلق بعد کو کچھ لوگوں کے دلوں میں کسی طرح کا شک و شبہ رہ جاتا کہ یوں اترا ہے یا یوں۔ مذکورہ بالا آیت میں اگرچہ مخاطب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر صرف آپ ہی کی تثبیت قلب مراد نہیں ہے بلکہ پوری امت کا ہر وہ شخص جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے اور قرآن میں ایمان داری کے ساتھ تدبر کرتا ہے سب کی تثبیت قلب مقصود ہے کیونکہ قرآن صرف رسول اللہ صلعم ہی کے لئے نہیں اترا ہے بلکہ سارے عالم کے لئے اترا ہے:

لیکون للعٰلمین نذیرا

تاکہ سارے عالم کے لئے نتائج نافرمانی سے ڈرانے والا ثابت ہو۔

صحابہؓ کو تثبیت قرآنی آیات کے نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا کرکے اترنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے پڑھنے ان کے معانی اور مطالب کے سمجھنے سے ہوتی تھی، وہ لوگ خود رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے سنتے اور سیکھتے تھے، اس لئے اس وقت تواتر و عدم تواتر ان کے لئے کوئی زیر غور مسئلہ ہی نہ تھا بلکہ وہی وقت تو قرآن کے اجزائی تواتر کے آغاز کا تھا، گو صحابہؓ اس کو سمجھ نہیں رہے تھے کہ قرآن مجید کے ہر جزء کا تواتر کس طرح بہم پہنچایا جا رہا ہے اور بہم پہنچ رہا ہے۔ مگر ہر آیت اور اس کے ہر لفظ بلکہ ہر حرکت و سکون کا تواتر پیدا ہو رہا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ بعد والوں کے لئے تثبیت قلب کا سامان مہیا کر رہا تھا کیونکہ تثبیت قلب کی محتاج رسول اللہ صلعم سے کہیں زیادہ آپ کی امت، بالخصوص آخری زمانے کی امت تھی جس کے پاس ایمانی سہارا قرآن کے سوا اور کچھ نہیں۔

---

[1] یہ علامہ موصوف کا اپنا استنباط ہے۔ اس کے متعلق ہم اپنی رائے طلوع اسلام بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۲ء کے باب المراسلات میں ظاہر کر چکے ہیں۔

Marfat.com

(۶) تواتر تعلیم و تعلّم: جس وقت سے قرآن مجید کا نزول شروع ہوا، جیسے جیسے آیتیں اور سورتیں اترتی گئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو ان آیتوں اور سورتوں کی تعلیم فرماتے رہے اور صحابہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اکابر صحابہ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں برابر حاضر رہنے کا موقع حاصل تھا وہ بذاتِ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے رہتے تھے اور آفاقی صحابہ، یا جو اپنے کاروبار کی وجہ سے برابر حاضر نہیں رہ سکتے تھے وہ ان حاضر باش صحابہ سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے تھے پھر ہر صحابی سے ان کی عورتیں، ان کے لڑکے اور لڑکیاں قرآن کی تعلیم حاصل کرتی تھیں جس سے مسلمانوں کا کوئی گھر خالی نہ تھا تعلیم و تعلمِ قرآن کا یہ تواتر نزولِ قرآن کے آغاز سے آج تک بلاناغہ پونے چودہ سو برس سے ہر مسلم گھر میں ساری دنیائے اسلام میں چلا آرہا ہے جس کی کوئی مثال ساری دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو نہیں پیش کر سکتی۔

(۷) تواتر قراءت: پڑھنے والے بہتیری کتابیں پڑھتے ہیں، پڑھنے کے بعد طاق پر رکھ دیتے ہیں بعض دلچسپ کتابیں اگر بار بار بھی پڑھتے ہیں تو پھر آخر اس سے جی بھر جاتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد اس کتاب کے دیکھنے سے دم اکھڑنے لگتا ہے کہ بار بار کی دیکھی ہوئی چیز کو کب تک دیکھتے رہیں۔

قرآن مجید کا یہ خاص معجزہ ہے کہ ع هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهٗ يَتَضَوَّعُ، یعنی مشک کو جتنا بھی ملیے، الٹ پلٹ کیجئے، اس کی خوشبو بڑھتی اور پھیلتی ہی جائے گی۔ قرآن مجید کا بھی یہی حال ہے کہ جس قدر پڑھئے، اس کے پڑھنے سے کبھی دم نہیں گھبراتا۔ کبھی سیری نہیں حاصل ہوتی، مطلب سمجھ کر پڑھنے والوں کا کیا پوچھنا ہے، بے معنی مطلب سمجھے لوگ بیٹھے ہوئے ہل ہل کر پڑھا کرتے ہیں اور روز آنہ پڑھے جاتے ہیں اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، زبانی پڑھتے ہیں، جس قدر جس کو یاد ہے۔ حفاظ برابر اس کا دور کرتے رہتے ہیں۔ نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ اگرچہ قراءت کا لفظ عام ہے کتاب دیکھ کر پڑھنے کو بھی قراءت کہتے ہیں، زبانی پڑھنے کو بھی، نمازوں میں پڑھنے کو بھی اور نماز سے باہر پڑھنے کو بھی۔ غرض ہر صورت سے قرآن مجید کے پڑھنے کا تواتر پونے چودہ سو برس سے آج تک بلاناغہ ہر مسلم گھر میں ساری دنیائے اسلام میں چلا آرہا ہے۔ مگر اس نمبر میں میری مراد زبانی پڑھنا ہے۔ کتاب دیکھ کر پڑھنے کو تلاوت[۱] کہتے ہیں۔ اس کے تواتر کی بحث میں چونکہ کتاب اور کتابت کی بحث بھی آجاتی ہے اسلئے کتاب کے تواتر کا ذکر ضروری ہے۔

(۸) تواتر کتابت: (قرآن کے لکھنے کا آغاز بھی اس کے نزول کے ساتھ ساتھ ہوا اور اس وقت سے جو کتابت قرآن کا سلسلہ تواتر شروع ہوا تو وہ پونے چودہ سو برس سے (۱۳۷۵) زیادہ کی مدت سے آج تک بلاناغہ جاری ہے۔ اس پونے چودہ سو برس کا کوئی دن ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس دن دنیائے اسلام میں کتابت قرآن کسی نے بھی نہ کی ہو، خیالی طور سے بھی ایسا کوئی دن تصور نہیں کیا جا سکتا)

شاید کوئی کہے کہ مکہ مکرمہ میں اس وقت کتابت لکھنے پڑھنے کا بہت کم رواج تھا، محض گنے چنے کچھ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، کاغذ سے عرب کا پورا خطہ بالکل محروم تھا، جو لوگ کچھ لکھتے تھے وہ ہڈی پتے، کھال، چھال، پتھر کے ٹکڑے اور ٹھیکریوں پر اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں پر وقتی طور سے وقتی ضرورت کے لئے کوئی یادداشت وغیرہ ہی لکھی جا سکتی ہے، کوئی مستقل چیز نہیں لکھی جا سکتی۔ تو یہ کہنا صحیح نہیں، کیونکہ مکہ معظمہ میں زمانہ جاہلیت ہی سے بہت کافی لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مکے کے آس پاس اہل کتاب بھی رہتے تھے

[۱] یعنی ہماری زبان میں۔ ورنہ عربی مبین میں جس میں قرآن نازل ہوا ہے تلاوت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ طلوع اسلام

ان کے پاس ان کی کتابیں تورات و انجیل کے نسخے لکھے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کی دیواروں سے شعراء سو سوا شعار کے قصیدے لکھ لکھ کر لگا دیتے تھے کہ آنے جانے والے ان کو پڑھیں جس ملک کے سارے لوگ اَن پڑھ ہوں اس ملک میں کس کے پڑھنے کیلئے یہ قصائد لگائے جاتے تھے؟ اور جب کاغذ ہی نہ تھا تو کس چیز پر لکھکر وہ قصائد دیواروں سے لگائے جاتے تھے اور اہل کتاب اپنی کتابیں کس چیز پر لکھتے تھے یہ جو مشہور ہے کہ مکے میں اہل کتاب نہ تھے، خاص مکے میں نہ ہوں مگر وہاں اگر اہل کتاب بالکل نہ تھے تو پھر انبیائے بنی اسرائیل کے واقعات کس کو سُنانے کیلئے مکی سورتوں میں مذکور ہوئے۔ مشرکین مکہ تو انبیائے بنی اسرائیل سے پوری طرح واقف بھی نہ تھے، نہ ان کے ماننے والے تھے، وہ ان کی داستانیں سن کر کیا متاثر ہوتے۔ سورۂ زخرف بالاتفاق مکی سورہ ہے اور مکہ میں اترنے والی چھیاسی سورتوں میں سے ترسیٹھویں سورت ہے جس میں بنی اسرائیل وانبیائے بنی اسرائیل کا ذکر موجود ہے۔ اس سورہ کے چوتھے رکوع کے آخر میں ارشاد ہے:

وَسْئَلْ مَنْ ارسلنا من قبلك من رسلنا ء اجعلنا من دون الرحمٰن الهة تُعبدون۔

(ای وَسْئَلْ اُمَمَ مَنْ اَرْسَلْنَا) یعنی تم سے پہلے اپنے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا تھا ان کی امتوں سے پوچھو کیا خدائے رحمٰن کے سوا دوسرے معبود ہم نے قرار دیئے جو پوجے جا سکیں؟

اگر مکہ یا حوالی مکہ میں اہل کتاب نہ تھے تو پھر یہ کن سے پوچھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا تھا؟ اور یہ جو بعض مفسرین نے لکھدیا ہے کہ یہ حکم شب معراج میں جو تمام رسولوں سے ملاقات ہوئی تھی اس موقع پر آپ کو پوچھنے کے لئے فرمایا گیا تھا۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ مگر آپ کو کوئی شک تو تھا نہیں اسلئے آپ نے کسی سے نہیں پوچھا کس قدر لغو و مہمل ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہو اور آپ اس کو بے ضرورت سمجھکر ٹال دیں اور تعمیل نہ کریں؟ معاذ اللہ من ذالک۔

اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ایسا حکم کیوں دیتے لگا جو لایعنی ہو، کیا اس میں نعوذ باللہ العظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شک تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنی چاہئے یا نہیں؟ کوئی دوسرا معبود ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں سے نعوذ باللہ آپ کی تشفی نہ ہوئی تو شب معراج میں فرمایا گیا کہ دوسرے رسولوں سے اس کو پوچھ کر اپنی تشفی کر لو؟ اور اگر آپ پوچھتے تو وہ اگلے انبیاء و مرسلین علیہم وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام آپ کے بارے میں کیا سمجھتے؟ یہ تو یہود و نصاریٰ سے محض بغرض اتمام حجت پوچھنے کیلئے فرمایا گیا تھا جس کو آپ نے ان لوگوں سے یقیناً پوچھا ہوگا اور وہ کچھ جواب نہ دے سکے ہوں گے۔

غرض یہ روایت بالکل موضوع و مکذوب ہے کہ آپ سے کہا گیا تھا کہ شب معراج میں اس کو دوسرے رسولوں سے پوچھیں۔ مختصر یہ ہے کہ حوالی مکہ میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور صابئین کی بود و باش بہت کافی تھی اور مکے والوں سے ان کے گہرے تعلقات تھے جب ہی تو سورۂ مریم وغیرہ بہتیری سورتیں جن میں انبیائے بنی اسرائیل کا کافی ذکر ہے مکہ ہی میں اتریں۔ اور یہ لوگ اپنی اپنی کتاب رکھتے تھے تورات یہودیوں کے پاس تھی اور انجیل عیسائیوں کے پاس صحف ابراہیمی کے نام سے صابئین بھی ایک مجموعہ رکھتے تھے۔ گو قرآن مجید نے ان کے اس مجموعے کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اسلئے کہ وہ بالکل من گھڑت تھے مگر تھے ضرور کتابی ہی صورت میں۔ تو اگر لکھنے پڑھنے کا رواج مکہ و حوالی مکہ میں نہ تھا تو پھر یہ کتابیں کہاں سے ان لوگوں کے پاس ہوتی تھیں اور جب پڑھنے والے ہی نہ تھے تو ان کتابوں کی

Marfat.com

کون پڑھتا تھا؟

جنگ بدر میں بیسیوں قیدیوں کا فدیہ یہی قرار دیا گیا تھا کہ وہ مدینے کے لڑکوں کو کتابت کی تعلیم کرکے ایک اچھا کاتب بنا دیں۔ اگر مکے کے کفار و مشرکین لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو یہ جنگ بدر کے قیدی جو سب کے سب مکے کے مشرکین تھے کس طرح مدینے کے لڑکوں کو لکھنے کی تعلیم کرسکے؟ انھیں مکے والوں میں سے بیسیوں آدمی ایمان لائے اور ایمان لانے والے کیا صرف وہی لوگ ایمان لاتے تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے؟ حضرت ابوبکر صدیق اکبر، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عثمان ذوالنورین حضرت علی مرتضیٰ، حضرت فاروق اعظم، حضرت حمزہ سید الشہداء وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین یہ سب شرفائے مکہ سے تھے۔ کیا یہ سب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے؟ تاریخ شاہد ہے کہ یہ سب لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے بہتیروں نے کتابت وحی کا کام بھی انجام دیا تھا۔

حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب بن نفیل رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ مشہور و معروف ہے کہ ان کی بہن فاطمہ بنت الخطاب رضی اللہ عنہا جو سعید بن زید بن عمرو بن نفیل یعنی حضرت فاروق اعظمؓ کے چچیرے بھائی کے بیٹے تھے ان کی بیوی تھیں اور یہ دونوں زن و شو ایمان لا چکے تھے اور دونوں زن و شو لکھے پڑھے تھے، حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ جو ایک کمسن صحابی تھے ان سے مصحف میں قرآن میں پڑھا کرتے تھے اور وہ مصحف حضرت خباب جیسے کمسن صحابی ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جو بہن کے اسلام قبول کر لینے کی خبر ملی تو غصے میں ان کے یہاں پہنچے۔ اس وقت حضرت خباب رضی اللہ عنہ ان کے یہاں موجود تھے اور قرآن پڑھا رہے تھے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بہنوئی اور بہن پر کچھ تشدد بھی کیا۔ آخر میں وہ مصحف مانگا جس میں یہ لوگ پڑھ رہے تھے ان کی بہن نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ تم مشرک ہو اور مشرک نجس ہوتے ہیں۔ تم غسل جنابت نہیں کرتے۔ اسلئے جب تک غسل کرکے نہ آؤ تم تمہارے ہاتھوں میں یہ کتاب نہیں دے سکتے کیونکہ اس کتاب کی شان یہ ہے کہ لا یمسہ[1] الا المطہرون حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان کے اصرار کو دیکھکر غسل کیا اور کتاب ہاتھ میں لیکر پڑھنا شروع کیا۔ پہلی نظر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر پڑی۔ سب سے پہلے اسی سے متاثر ہوئے پھر سورۂ طٰہٰ[2] کو پڑھ گئے۔ جب لتجزی کل نفس بما تسعیٰ تک پہنچے تو بولے ما اطیب ھذا الکلام و احسنہ کیسا اچھا کلام ہے اور کتنا حسین انداز بیان ہے۔ پھر اذا الشمس کورت کا سورہ پڑھنے لگے جب علمت نفس ما احضرت تک پہنچے بہت متاثر ہوئے، آگے پڑھتے تو بسم اللہ کے بعد دیکھا سبح للہ ما فی السمٰوٰت والارض پڑھا تو کچھ مرعوب سے ہو گئے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور کانپنے لگے۔ یہاں تک کہ پڑھا فامنوا باللہ ورسولہ[3] تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہہ اٹھے کہ اشہد

---

[1] یہ آیت سورۂ واقعہ کی ہے جو مکی سورتوں میں سے بقول علماء چھیالیسواں سورہ ہے اور سورۂ طٰہٰ کے بعد اترا تھا۔

[2] روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام جلد اول ص ۲۱۷ و ۲۱۸ - ورياض النضرہ وغیرہما۔

[3] سبح للہ ما فی السمٰوٰت والارض اور فامنوا باللہ ورسولہ اور بھی کچھ آیتیں جو اس روایت میں ریاض النضرہ وغیرہ میں لکھی ہیں یہ سب سورۂ حدید کی آیتیں ہیں اور علماء اس سورہ کو مدنی لکھتے ہیں اسلئے یا تو یہ روایت غلط ہے یا اس سورہ کا مدنی ہونا صحیح نہیں مگر روایت پھر بھی مسند ہونے کی وجہ سے اقوال علماء سے زیادہ قریب الی الصحۃ ہے جبکہ اس روایت میں کوئی بات نص قرآنی کے خلاف نہیں۔ اسلئے میرے نزدیک یہ روایت صحیح ہے اور سورۂ حدید مکی سورہ ہے ورنہ کم از کم یہ ماننا چاہئے کہ اس کے کچھ حصے مدینے میں اترے اور کچھ حصے مکے میں۔ ۱۲ منہ غفرلہ

ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ۔ اس کے بعد بارگاہ نبوی کی طرف چلے۔ سورۂ طٰہٰ پینتالیسواں[۴۵] سورہ کہا کہا جاتا ہے۔ اس وقت کی سورتوں میں سے نصف سے زیادہ سورتیں اتر چکی تھیں اور یقیناً اس صحیفے میں جس کو حضرت فاروق اعظمؓ رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن رضی اللہ عنہا سے لیکر دیکھا تھا اس میں وہ سب سورتیں جو اس وقت تک اتری تھیں، لکھی ہوئی تھیں کیونکہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ حضرت سعید بن زید اور ان کی بیوی حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کو قرآن کی تعلیم ہی کے لئے وہ مصحف لیکر آئے تھے، کوئی وجہ نہیں کہ بعض سورتوں کی وہ تعلیم کریں اور بعض سورتوں کی تعلیم نہ کریں۔ یا یہ لوگ بعض سورتوں کی تعلیم حاصل کریں اور بعض کی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہ سمجھیں۔ اور نہ یہ بلا دلیل کہا جا سکتا ہے کہ اس صحیفے میں صرف سورۂ طٰہٰ اور تکویر ہی لکھی جاتی تھی یا سورۂ حدید کی وہ آیتیں جو مکے میں اتری تھیں اور سورتیں اس میں لکھی ہوئی نہ تھیں کیونکہ صحیفہ لکھنے والے نے یقیناً پہلے انھیں سورتوں کو لکھا ہوگا جو پہلے اتریں۔ اگر کہا جائے کہ ترتیب نزول کے مطابق رسول اللہؐ جمع نہیں کرا رہے تھے بلکہ لوح محفوظ کے مطابق جمع کرا رہے تھے، جب بھی سورۂ مریم و سورۂ اعراف کو تو بہرحال اس صحیفے میں ہونا چاہئے اور پھر یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ جو سورتیں اتر چکی تھیں ان کو آپ صرف اس انتظار میں لکھواتے ہی نہیں کہ ابھی وہ سورتیں نہیں اتری ہیں جو لوح محفوظ میں ان سے پہلے ہیں۔ سورتوں کی ترتیب لوح محفوظ کے مطابق مصاحف میں تو پورے قرآن کے اتر جانے کے بعد قائم کی گئی۔

حضرت فاطمہؓ بنت الخطاب نے جو لا یمسہ الا المطہرون کی آیت پڑھکر حضرت عمرؓ کو بغیر غسل کئے قرآن ہاتھ میں لینے کی اجازت نہ دی تو اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سورۂ واقعہ بھی جو بقول علماء چھیالیسواں کی سورہ ہے اور سورۂ طٰہٰ کے بعد اترا تھا، اس کو اس واقعے سے پہلے حضرت فاطمہ حضرت خباب سے پڑھ چکی تھیں اور اس صحیفے میں سورۂ واقعہ بھی لکھا ہوا ضرور ہوگا اسلئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صرف سورۂ طٰہٰ و سورۂ تکویر و آیات سورۂ حدید کے پڑھ لینے سے یہ سمجھنا کہ بس اُسی قدر اس صحیفے میں لکھا ہوا تھا، حضرت سعید بن زید و حضرت فاطمہ بنت الخطابؓ نے بس اسی قدر حضرت خبابؓ سے پڑھا تھا، ایسا ہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس وقت تک بس اسی قدر قرآن اترا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پورا مصحف تھا جو کچھ اس وقت تک اترا تھا وہ سب اس میں موجود تھا۔ حضرت عمرؓ نے جا بجا سے الٹ پلٹ کر پڑھا تھا بہرحال یہاں اس سے تو بحث ہی نہیں ہے کہ اس صحیفے میں کتنا حصہ قرآن لکھا ہوا تھا، جتنی سورتیں اسوقت تک اتری تھیں وہ سب اس میں لکھی ہوئی تھیں یا نہ تھیں اس صحیفے میں وہ ساری سورتیں ہوں یا نہ ہوں مگر یقیناً کتنے صحیفے کتنے صحابہ کے پاس ایسے ضرور اس وقت ہوں گے جن میں اسوقت تک کی اتری ہوئی سب سورتیں لکھی ہوئی مجتمع ہوں گی اور وہ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا سامان رکھتے تھے۔ فقط مرد ہی نہیں عورتیں بھی لکھی پڑھی تھیں۔ حضرت شفا بنت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ذکر میں اپنی کتاب تنقید حدیث جمع قرآن میں کر چکا ہوں جن سے حضرت ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا نے کتابت سیکھی تھی۔ یہ حضرت شفا اسلام قبول کرنے سے پہلے ہی سے کتابت جانتی تھیں۔

Marfat.com

غرض جب یہ معلوم ہو چکا کہ مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان میں سے جو نہیں جانتے ہوں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تحصیل علم اور قرآن کی تصریح کہ علم بالقلم یعنی علم قلم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یقیناً جو کتابت نہیں جانتے تھے انھوں نے بھی سیکھ لی ہوگی۔ اور تحصیل علم سے مراد تحصیل قرآن کے سوا ان لوگوں کے لئے کچھ اور نہ تھا ہی کیا۔ اس لئے کون صحابی ہوگا جو قرآن کی تلاوت وحفظ اور کتابت میں مصروف نہ ہوگا۔ قرآن لکھکر اگر اپنے گھر نہ لاتا تو اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو کس طرح قرآن کی تعلیم دیتا۔ زبانی یاد کرانے کے لئے کافی وقت چاہیئے اور حروف شناسی کے بعد کتاب دیکھکر پڑھنے والا بطور خود بھی یاد کر سکتا ہے، قرآن ان کی مادری زبان میں اترا تھا سمجھنے میں کوئی دشواری کسی کو تھی ہی نہیں اسلئے یاد کرنے کی دو ہی صورتیں تھیں یا تو اندھے حافظوں کی طرح صرف زبانی سن سن کر یاد کرتے، یا کتاب دیکھ دیکھ کر یاد کرتے۔ کتاب دیکھکر یاد کرنا ان کے لئے خصوصاً بالکل سہل تھا اور ہر شخص کے لئے سہل ہوتا ہے۔ ورنہ زبانی یاد کرانے والے کو دیر تک ساتھ بیٹھکر یاد کرانے میں وقت بہت صرف کرنا پڑتا ہے۔ اسلئے عورتیں بچے سب نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہوگا اور پھر ہر گھر میں قرآن مجید کے متعدد نسخے ہونگے۔ غرض آغاز نزول قرآن کے وقت ہی سے کتابت قرآن کا سلسلہ صحابہ نے عام طور سے شروع کر دیا تھا اور اس وقت سے اس کا تواتر آج تک پورے چودہ سو برس سے چلا آرہا ہے۔ اس درمیان کا کوئی دن ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ کوئی ساعت ایسی خیال نہیں کی جا سکتی ہے جس میں قرآن مجید کی کتابت دنیائے اسلام میں کہیں نہ کہیں نہ ہوتی رہی ہو۔

اہلِ عرب اور صحابہؓ کی مہارت فن املا و انشاء

یہاں یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ اہلِ عرب زمانہ جاہلیت میں بھی لکھنا پڑھنا محض معمولی طور سے نہیں جانتے تھے بلکہ فن املا و انشاء سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ ان ماہرین میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے وہی لوگ کتابت وحی کے لئے منتخب کئے جاتے تھے ڈاکٹر زکی مبارک عبدالسلام المصری نے اپنی کتاب النثر الفنی جلد اول ص۴۸ کے حاشیے میں لکھا ہے کہ

یذکر ابو هلال فی کتاب الصناعتین ص۳۵۱ ان اکثم بن صیفی کان اذا کاتب ملوك الجاهلية يقول لكاتبه "افصلوا بين كل منقضى معنى، وصلوا اذا كان الكلام معجونا بعضه ببعض" وان الحارث بن شمر الغسانی كان يقول لكاتبه المرقش "اذا نزع بك الكلام الى الابتداء بغير ما انت فيه فافصل بينه وبين تبيعته من الالفاظ. فانك ان مذقت الفاظك بغير ما يحسن ان تمذق، نفرت القلوب عن وعيها وملتها الاسماع واستثقلتها الرواة" وفى امثال هذه الكلمات دليل على ان الرواة نقلوا عن الجاهليين احكاما فى صناعة الكلام

یعنی "ابو ہلال[1]" کتاب الصناعتین کے ص۳۵۱ میں لکھتے ہیں کہ اکثم بن صیفی کے مکاتبات جب شاہان زمانہ جاہلیت سے ہوتے تھے تو یہ اپنے کاتب سے کہتے تھے کہ "جب مضمون تمام ہو جائے تو تحریر میں فصل قائم کرو۔ (یعنی اس پیراگراف کو ختم کر کے دوسرا پیرا شروع کرو، یا ڈیش دیدو) اور حارث بن شمر الغسانی اپنے کاتب "مرقش" سے کہتے تھے کہ "تم جس مضمون کے لکھنے میں لگے ہو، اس کے سوا جب کسی

[1] ابو ہلال حسن بن عبداللہ بن سہل العسکری۔ یہ پانچویں صدی ہجری کے علمائے ادب میں سے ہیں ان کی کتاب "کتاب الصناعتین" مشہور و معروف ہے ۱۲۔

26626

Marfat.com

کلام کی ابتدا کی طرف آؤ تو اسمیں اور اسکے متابع الفاظ میں فصل پیدا کرو، کیونکہ تم نے اگر اپنے الفاظ کو خلط ملط کر دیا ایسے موقع پر جہاں ان کا خلط ملط کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا تو تم نے پڑھنے والوں کے دلوں کو اس کے ذہن نشین کرنے سے متنفر کر دیا اور کان ان کے سننے سے پُر ملال ہوں گے اور اس کے روایت کرنے والوں پر وہ تحریر بار ہوگی" اس طرح کے کلام اس بات کی دلیل ہیں کہ روایت کرنے والے زمانۂ جاہلیت والوں سے صنائع کلام، تحریری و تقریری نقل کرتے رہے۔

اور اس کتاب النثر الفنی جلد اول کے ص۵۲ میں لکھا ہے کہ

وکذلک یری ابن فارس ان معرفة القدماء من الصحابة بکتابة المصحف علی النحو الذی یعللہ النحویون فی ذوات الواو والیاء والھمزة والمد والقصر تدل علی فھمھم لاصول اللغة وقواعد الکتابة وھو یری ان العلوم العربیة کانت معروفة قبل الاسلام

یعنی ابن فارس کو اس کا یقین ہے کہ قدمائے صحابہؓ کو کتابت قرآن میں جو واقفیت ان باتوں سے تھی جن میں علمائے نحو فرق کرتے ہیں لغات وادی و یائی و مہموز میں اور مد قصر وغیرہ میں، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اصول لغت اور قواعد کی کافی درانست رکھتے تھے اور اس سے اس کا پتہ ملتا ہے کہ علوم عربیہ اسلام کے قبل ہی سے ایک حد تک لوگوں میں متعارف تھے۔

مختصر یہ ہے کہ اہل عرب اور خصوصاً اہل حجاز کو بالکل جاہل اور ان پڑھ سمجھنا نہایت خطرک غلطی ہے اور جن لوگوں نے شروع شروع اسکو مشہور کیا انھوں نے بعد والوں کو ایک افسوسناک اور گمراہ کن مغالطے میں ڈالا جسکی تفصیل انشاءاللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

۹۔ **تواتر تلاوت** "تلاوت" کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، یا کسی کے فوراً بعد آنا۔ کتاب کی تلاوت کے معنی کتاب کا مطلب سمجھ سمجھ کر پڑھنا۔ کتاب میں لکھے ہوئے حروف دیکھ دیکھ کر پڑھنا۔ قرآن پاک کے لئے اس لفظ کا استعمال خاص طور سے ہے۔ اہل کتاب بھی جو تورات و انجیل و زبور معنی سمجھ سمجھ کر یا دیکھ دیکھ کر پڑھتے ہیں تو اس کو بھی تلاوت کہا جاتا ہے، قرأت عام ہے اور تلاوت خاص۔ تو قرآن مجید کی تلاوت یعنی اس کی آیتوں کے معنی مطلب سمجھ سمجھ کر پڑھنے کا اور کتاب دیکھ دیکھ کر پڑھنے کا تواتر زمانۂ نبوی سے آج تک بلا فصل چلا آرہا ہے اتنی طویل مدت میں کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ دنیائے اسلام میں ہزاروں بلکہ کروڑوں صاحب توفیق مسلمان قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف نہ رہے ہوں۔

صحابہ میں قرآن کے حفاظ کی تعداد تقریباً ننانوے فی صدی تھی اس لئے وہ لوگ زبانی قرآن پڑھا کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا کہ

اعطوا اعینکم حظھا من القرآن (مسند احمد ص)

قرآن میں جو حصہ تمہاری آنکھوں کا ہے وہ اپنی آنکھوں کو بھی دیا کرو۔ (یعنی قرآن کتاب دیکھکر پڑھا کرو)

اور مشکوٰۃ میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قراءة الرجل فی غیر المصحف الف درجة وقراءته فی المصحف تضعف علی ذلک الی الفی درجة یعنی قرآن بلا مصحف کے زبانی پڑھنا ہزار گونہ ثواب کا درجہ رکھتا ہے اور مصحف میں دیکھکر پڑھنا دو ہزار گونہ ثواب کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ باب فضائل القرآن ص۱۸۱ آخر صفحہ)

Marfat.com

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ترغیب اور تاکید کی وجہ سے صحابہ حتی الوسع مصحف دیکھ دیکھ کر ہی قرآن مجید کی تلاوت کے عادی سے ہوگئے تھے اور آج بھی جو لوگ حافظ نہیں ہیں وہ تو قرآن مجید دیکھ دیکھ کر پڑھتے ہی ہیں۔ حفاظ بھی اپنے سامنے قرآن مجید کھلا رکھ کر عموماً تلاوت کیا کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

تواترِ حفظ

قرآن مجید کے حفظ کرنے کا سلسلہ آغاز نزول قرآن ہی کے وقت سے شروع ہوگیا۔ جو مسلمان ہوا اس نے قرآن کی آیتیں سنیں اور یاد کرلیں، کیونکہ قرآن ان لوگوں کی اپنی مادری زبان میں اترا تھا۔ اس کی فصاحت اور بلاغت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ جس آیت کو وہ لوگ ایک بار سُن لیتے تھے وہ آیت ان کے دلنشین ہوجاتی تھی، آج بھی کوئی اچھا شعر، کوئی دلچسپ مقولہ کوئی سُن لیتا ہے اور اس کا ذوق اس کو بل جاتا ہے تو صرف ایکبار سن لینے سے وہ شعر یا وہ مقولہ یاد ہوجاتا ہے اور ایسا یاد ہوجاتا ہے کہ ذہن سے نکلتا نہیں۔ اور قرآن مجید تو اسوقت ہر مسلمان کا تنہا سرمایۂ ایمان تھا کسی صحابی سے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی نازل شدہ آیت کے نزول کی خبر سننے کے بعد اس کو بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھے اور اس آیت کو بغیر یاد کئے رہتا۔ جبھی تو قرآن مجید کے متعلق فرمایا گیا ہے:۔

بَلْ هُوَ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فی صدور الذین اوتوا العلم (   ) "بلکہ وہ واضح اور روشن آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے"۔

"جن کو علم دیا گیا" سے مراد سارے مومنین ہیں یعنی جتنے لوگ اسوقت ایمان لے آئے تھے ان کا ایمان لے آنا ہی ان کے صاحب علم ہونے کا ثبوت ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ (علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور ہر مسلم عورت پر فرض ہے) تو پھر اس وقت کا کونسا مسلم مرد ہوگا اور کونسی مسلمہ عورت ہوگی جو طلب علم میں مصروف نہ ہوگی۔ اور اس وقت علم حاصل کرنے کے معنی ہی یہی تھے کہ قرآن یاد کیا جائے اس کے معانی اور مطالب پر عبور حاصل کیا جائے اسی لئے ہر صحابی حفظ قرآن میں مصروف تھا اور اپنی دماغی اور ذہنی صلاحیت کے مطابق قرآن سمجھتا تھا اور قرآن میں تدبر و فکر کرتا تھا۔ ذہنی و دماغی صلاحیتوں کے تفاوت کی وجہ سے جماعت صحابہؓ میں علمی تفاوت بھی ضرور تھا۔ آج جتنے علما ہیں سب کے سب علم و فضل و وسعتِ نظر میں کیا برابر ہیں؟ مگر سب علما ہی کہے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر صحابی الذین اوتوا العلم "جو لوگ علم دیئے گئے ہیں" میں داخل تھا۔ سب صاحب علم تھے اسی لئے اسلام سے قبل کے زمانے کو "جاہلیت کا زمانہ" کہتے ہیں اسلام آیا اور "عالمیت کا زمانہ" آیا۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا اور قرآن کا علم حاصل کیا وہ "عالم" ہوگئے۔ جنھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنے کفر پر قائم رہے وہ جاہلیت پر قائم رہے اور جاہل رہے۔

غرض حفظ قرآن کا سلسلہ بھی عہد نبوی سے آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ اس پونے چودہ سو برس کے اندر کوئی دن ایسا نہیں گذرا جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں حافظِ قرآن دنیا میں موجود نہ ہوں اور نئے نئے حافظ نہ ہو رہے ہوں اور کچھ نہ کچھ مختلف شہروں اور بستیوں میں حفظ قرآن میں مصروف نہ ہوں۔

۱۱ **تواترِ دَور** "دَور" سے مراد ایک حافظِ قرآن کا دوسرے حافظِ قرآن کو اپنے حفظ کی جانچ اور مشق و مہارت کے لئے قرآن کا زبانی سنانا ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سناتے تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو سناتے تھے جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال دوبار آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دَور فرمایا، یہ مشہور روایت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں، صحاح و غیر صحاح کی متعدد کتابوں میں موجود ہے۔

پھر صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سناتے تھے اور ایک صحابی دوسرے صحابی کو سناتے تھے۔ اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے کہ حفاظ ایک دوسرے کو سنایا کرتے ہیں۔

تنہا بھی حفاظ روزانہ قرآن کا دور کرتے ہیں صرف اپنے حفظ کو باقی رکھنے کے لئے۔ دَور کے وقت معانی و مطالب کا خیال رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ صرف یاد کی مشق مقصود ہوتی ہے۔ اور یہ چیز ایسی ہے جو حفاظ کیلئے ضروری ہے۔

۱۲ **تواترِ تدبر** قرآن مجید میں آیا ہے

افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالها (—)

کیوں نہیں لوگ قرآن میں تدبر یعنی غور و فکر کرتے ؟ کیا دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

اسی لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت ہی سے ہر مسلم تلاوتِ قرآن تدبر یعنی اس کے معنی و مفہوم کو سمجھتے ہوئے غور و فکر کے ساتھ کرتا تھا، صحابہؓ کے بعد تابعین اور ان کے بعد اتباع تابعین، پھر اتباع کے اتباع پھر ان کے اتباع۔ غرض چار پانچ صدی تک مسلسل ہر مسلم تلاوتِ قرآن تدبر و تفکر کے ساتھ ہی کرتا تھا۔ اور اس وقت تک ہر مسلم اتنی عربی جاننا اپنے پر فرض سمجھتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی آیات کریمہ کے معانی و مفاہیم کو عموماً سمجھ سکے عجمی مسلمان بھی اتنی عربی ضرور سیکھ لیتے تھے۔

اس کے بعد منافقینِ عجم نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ جب تک قرآنی آیات و سُوَر کے متعلق یہ علم پوری طرح حاصل نہ ہو کہ کون آیت اور کون سورت پہلے اتری ہے اور کون بعد کو۔ کون مکی ہے اور کون مدنی، کون ناسخ ہے اور کون منسوخ، کون محکم ہے اور کون متشابہ، کون عام ہے اور کون خاص، کس آیت کی کونسی شان نزول ہے، اور کس آیت کی تفسیر حدیث میں کیا آئی ہے۔ وغیر ذلک۔ اس وقت تک ان لوگوں کے لئے جو ان باتوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں قرآن میں بطور خود تدبر و تفکر کرنا حرام ہے۔ بس جو اگلے مفسرین و فقہاء و مجتہدین جس آیت کے جو معنی لکھ گئے ہیں اسی کے مطابق سمجھنا چاہئے اور اسی پر ایمان رکھنا چاہئے۔ اگلوں کی رائے کے خلاف رائے قائم کرنا چونکہ تفسیر بالرائی ہے اسلئے حرام ہے۔ غرض اگلے مفسرین جن کے امام اور استاذ الکل ابوجعفر محمد ابن جریر طبری ہیں جو ایک شیعہ مفسر تھے جن کے بارے میں حافظ ابوالفضل احمد بن علی البیکندی متوفی ۵۰۰ھ جیسا محدث اور جلیل القدر امام الحدیث والرجال، جن کے متعلق انساب سمعانی ورق ۳۰۵ میں لکھا ہے کہ لم یکن لہ نظیر فی زمانہ اسناداً و حفظاً و درایۃ بالحدیث وضبطاً و اتقاناً۔ اور جن پر کسی شخص کی کوئی جرح نہیں ہے، انھوں نے ان ابن جریر مفسر و مورخ مشہور کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ کان

Marfat.com

یصنع للرافض۔ یعنی ابن جریر طبری رافضیوں کی حمایت میں حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور انھیں کے پیچھے پیچھے تقریباً سارے مفسرین چلتے رہے اور انھیں کی پیش کردہ روایتوں کے مطابق تفسیریں لکھتے رہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اور ابن جریر سے بھی پہلے سدی و کلبی و ضحاک و جبیر ہی جیسے لوگوں سے بچانوے فی صدی تفسیری روایتیں ہیں اور باوجود اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کے مجروح اور سخت مجروح ہونے پر ائمہ حدیث و رجال کا اتفاق ہے مگر ان کو وضاع یا کذاب یا کم از کم منکر الحدیث و متروک قرار دیتے ہوئے بھی تفسیری حدیثیں سب کے سب انہی جیسوں سے لیتے رہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۲۴ ترجمہ جبیر بن سعید الازدی ابو القاسم البلخی (متوفی ۱۴۰ھ سے ۱۵۰ھ تک کے اندر) میں لکھتے ہیں:-

قال ابو قدامہ السرخسی قال یحیی القطان تساھلوا فی اخذ التفسیر عن قوم لا یوثقونھم فی الحدیث ثم ذکر الضحاک وجویبر او محمد بن السائب (الکلبی) وقال ھولاء لا یحمل حدیثھم ویکتب التفسیر عنھم۔

یعنی امام ابو قدامہ سرخسی نے فرمایا کہ امام الحدیث یحیی القطان نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں نے ایسی جماعت سے تفسیر لینے میں تساہل برتا جنکو حدیثوں کے موقع پر قابل وثوق نہیں سمجھتے۔ پھر ضحاک اور جویبر اور محمد بن السائب الکلبی کا ذکر فرمایا اور کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حدیث تو برداشت نہیں کی جاتی مگر ان کی تفسیر لکھی جاتی ہے۔

غرض یہ عالم ہے دنیائے تفسیر کا، اور تقریباً چھ سات سو برس سے یا اس سے کچھ بعد سے ہمارے علماء آج تک یہی کہتے آرہے ہیں، تم خود اپنی عقل اور اپنی سمجھ سے کام نہ لو، بس جو اگلے مفسرین لکھ گئے ہیں اسی پر ایمان رکھو اور اسی کو قرآن کا صحیح معنی و مفہوم مانتے رہو۔ چاہے وہ تفسیر، وشان نزول کی روایت، قرآنی آیت کے سیاق و سباق کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ غرض اس گمراہ کن پروپیگنڈے کے اثر سے اگرچہ بہت لوگ قرآنی آیات میں تدبر و تفکر کا وہ آزادانہ طریقہ جو خیر القرون میں ہر مسلم کا تھا اس کو تو بہت حد تک چھوڑ بیٹھے مگر انھیں تفسیری روایتوں کے حدود میں رہ کر تدبر اور تفکر ضرور کرتے رہے اور جہاں کسی روایت کو ان کی دیانت نے قبول نہ کیا تو پھر وہ روایت لکھکر اس کی تردید بھی کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً سورۂ اعراف کے آخری رکوع کی پہلی آیت پڑھئے۔ اور فلما تغشٰھا حملت حملا خفیفا فمرت بہ کی تفسیر و شان نزول کی روایت ملاحظہ فرمائیے اور پھر قاضی بیضاوی نے جو اپنی کتاب تفسیر بیضاوی میں اس روایت کی تردید کی ہے اس کو دیکھئے اور اس کے بعد محشی بیضاوی نے جو ان کی تردید پر خفگی ظاہر کی ہے اور اس روایت کو صرف اس سبب سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ روایت فلاں فلاں کتابوں میں مذکور ہے، اس پر بھی نگاہ عبرت ڈالئے۔

مختصر یہ کہ فرقہ بندی اور روایت پرستی کا جب دَور دورہ ہوگیا تو پھر تدبر فی القرآن کا رُخ بھی بدل گیا اور تدبر کا مقصد صرف اپنے فرقے کی حمایت یا روایت پرستی کے صنم خانے کی کھوکھلی دیوار کی پُشتیبانی ہی رہ گئی مگر صحیح یا غلط تدبر فی القرآن کرنے والے ہر زمانے میں رہے۔ عہد نبوی سے لیکر اس وقت تک کوئی ایسا دن نہیں پیش کیا جا سکتا جس میں کوئی نہ کوئی تدبر فی القرآن نہ کر رہا ہو۔ اور وہ اپنے نزدیک صحیح ہی معنی میں تدبر نہ کر رہا ہو۔ چاہے کسی کا تدبر در حقیقت غلط ہی کیوں نہ ہو۔ غرض اس تدبر فی القرآن کا تواتر بھی مذکورہ بالا تواترات کی طرح آج تک عہد نبوی سے اسوقت تک بلا انقطاع چلا آرہا ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

۱۳ **تواتر استنباط** احکام شرعی میں سے وہ احکام جن کا تعلق حقوق و معاملات سے ہے، اس کے متعلق چونکہ آئے دن بعض ایسی ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں جو پہلے کبھی پیش نہیں آئی تھیں۔ یا اگر عقلاً پیش آئی بھی ہوں تو اس کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس قسم کی کون صورت پہلے عہد نبوی یا عہد خلفائے راشدین میں بھی پیش آئی تھی اور اس وقت اس صورت کے بارے میں یہ فتویٰ صادر ہوا تھا اور ایسی کوئی روایت نہیں ملتی یا ملتی تو ہے مگر نا قابل قبول ذرائع سے تو یقیناً اس وقت کے مدبرین فی القرآن اور مفکرین فی الکتاب کا یہ فرض ہوگا کہ وہ قرآنی آیات میں تدبر کرکے اس صورت کے متعلق کوئی حکم منشائے قرآنی کے مطابق استنباط کریں۔ عہد نبوی سے لیکر ائمہ مجتہدین تک۔ پھر مجتہدین کے تلامذہ اور پھر ان کے تلامذہ یہانتک کہ اسوقت تک جب کوئی نیا مسئلہ سامنے آجاتا ہے جس کی کوئی نظیر سابق نہیں ملتی تو باوجود اپنی کورانہ تقلید کے حضرات مقلدین بھی استنباط مسائل پر مجبور ہوجاتے ہیں اور قرآنی آیات میں تدبر کرکے استنباط حکم کی سعی کرتے ہیں۔ مثلاً بینک کا سود، انشورنس، وغیرہ کہ ان چیزوں کے متعلق سوالات کا جواب ہدایہ و شرح وقایہ یا بخاری و مسلم میں صراحتہً نہیں ملنے کا۔ لامحالہ استنباط ہی کرنا پڑے گا اور دینی احکام کا استنباط قرآن مبین ہی سے ہوسکتا ہے جو اصل قانون الٰہی ہے۔ اس کے بعد حدیثوں سے عہد نبوی و عہد خلفائے راشدین و زمانہ مجتہدین وغیرہ کی نظیریں زیر غور آئیں گی۔ البتہ جو لوگ اصل قانون اور نظائر کا فرق نہیں سمجھتے وہ قرآن مجید کو معزول یا منسوخ یا معطل قرار دے کر صرف روایات و اقوال ہی سے استنباط بھی کریں یہ اور بات ہے۔ مگر وہ بھی مجبور ہیں کہ صحیح یا غلط اپنے استنباط کو قرآن سے بھی مستند و مؤید قرار دینے کے لئے دو ایک آیت بھی ضرور پیش کردیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مبین کے بغیر ان کا کوئی دینی استنباط والاحکم قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

غرض تدبر فی القرآن کی طرح قرآن سے استنباط احکام کا تواتر بھی عہد نبوی سے آج تک مسلسل بلا انقطاع چلا آرہا ہے: اس پونے چودہ سو برس کے اندر دنیائے اسلام میں کوئی ایسا دن نہیں گذرا جس میں کوئی نہ کوئی عالم دین کسی نہ کسی دینی مسئلے میں قرآن سے استنباط نہ کررہا ہو۔

ماحصل تواتر اسنادی کی تینوں قسموں کو الگ الگ ایک ایک قسم شمار کیجئے تو یہ سولہ قسموں کے تواترات ہوئے اور ہر تواتر ایسا مسلسل اور غیر منقطع جو پونے چودہ سو برس سے آج تک اس طرح چلا آرہا ہے کہ اتنی طویل مدت کا کوئی دن ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس میں ان تواترات شانزدہ گانہ میں سے کسی ایک تواتر کو بھی منقطع کہا جاسکے۔ کیا قرآن مجید کے سوا دنیا کی کسی اور چیز میں اس قسم کا تواتر تام و کامل و مکمل اپنے شانزدہ گانہ اقسام کے ساتھ دکھایا جاسکتا ہے؟ لا واللہ!

میں تواتر کو آغاز بحث میں "لاریبیت" کی سرخی کے ماتحت کسی گذشتہ چیز یا گذشتہ بات یا کسی ایسی چیز کے متعلق جو بہت زمانے سے چلی آرہی ہے، یقین قطعیت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ثابت کرچکا ہوں۔ ہر شخص کوئی بات نہ جانتا ہو وہ دوسروں سے پوچھکر یقین حاصل کرے اس کا علم خود قرآن مبین میں موجود ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون "اگر تم نہ جانتے ہو تو جو لوگ یاد رکھنے والے ہیں (یا علم رکھنے والے ہیں) ان سے پوچھ لو۔

Marfat.com

جس سے صاف ظاہر ہے کہ دس واقف کار جس بات کو یک زبان ہو کر بیان کریں وہ بات یقین کر لینے کے قابل ہے۔ تو پھر جن باتوں کو ساری دنیا متفق اللفظ ہو کر بیان کر رہی ہے وہ باتیں کیوں موجب یقین نہ ہوں گی۔

تواتر مصنوعی تواتر کی ایک قسم مصنوعی بھی ہے یعنی کسی ایک جماعت نے اپنے کسی خاص مقصد کے ماتحت ایک جھوٹی بات گھڑی اور باہمی صلاح و مشورہ کر کے اس جماعت کے افراد مختلف دور و نزدیک مقامات میں پھیل کر اس جھوٹی بات کو سچی قرار دے کر مشہور کرنے لگے اور پھر جن لوگوں نے اس جماعت کے افراد سے سنا وہ لگے اس کو دوسروں سے بیان کرنے۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد وہ جھوٹی بات ایک سچی خبر متواتر بن کر دنیا میں رفتہ رفتہ مشہور ہو گئی۔ عجمی ملحدین و منافقین نے ایک زبردست سازش کر کے اس طرح کتنی جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر پھیلائیں اور باوجود محدثین کی کافی چھان بین کے آج تک ان کے مجلدات میں کتنی موضوع و مکذوب حدیثیں موجود ہیں اور انھیں حدیثوں کی بدولت آج امت میں اسقدر دینی فرقہ بندیاں اور اختلافات موجود ہیں۔

اسی قسم کے مصنوعی متواترات آپ کو روایت پرستوں اور فرقہ بندوں میں بہت ملیں گے۔ مگر ان مصنوعی متواترات کا اگر آپ تجزیہ کریں گے تو ان کے تواتر کی حقیقت کھل جائے گی۔ اور ان کا مصنوعی ہونا آپ پر آفتاب نیمروز کی طرح روشن ہو جائے گا۔ یعنی اس خبر متواتر کے تواتر اسناد و تواتر مسند و تواتر مسند الیہ کو دیکھیے اس کے تواتر زمانی و تواتر مکانی کو دیکھیے۔ صرف انھیں پانچ تواتروں پر نگاہ نقد و نظر ڈالنے کے بعد ہر متواتر مصنوعی اور ہر تواتر غلط کی حقیقت معلوم ہو جائے گی اور بدیہی قرائن بھی ایسے جھوٹے متواترات کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اگر غلو و تعصب اور ضد اور ہٹ دھرمی سے الگ ہو کر دیانتہً ان مصنوعی متواترات کو دیکھا جائے اور ان کے تجزیہ کے بعد قرآن کی روشنی میں حقیقت کی جستجو کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ حقیقت امر کا پتہ نہ ملے۔

مثلاً جمع قرآن ہی کا واقعہ لے لیجیے۔ عوام میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع قرآن تھے۔ یہاں تک کہ جمعہ و عیدین کے خطبوں میں عام طور سے حضرت عثمانؓ کے نام مبارک کے ساتھ جامع القرآن کا لفظ پڑھا جاتا ہے اور جاہل ہی خطیب نہیں بلکہ علمائے کرام بھی بغیر کسی جھجک کے دعلی جامع القران امیر المؤمنین عثمان بن عفان خطبوں میں پڑھا کرتے ہیں۔

مگر جب علماء کو چھیڑیئے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں اصل جامع قرآن تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں حضرت عثمانؓ نے تو اسی عہد صدیقی کے جمع کئے ہوئے قرآن کی متعدد نقلیں کرا کے مختلف ملکوں میں بھجوادی تھیں اور ایک نقل اپنے پاس رکھ لی تھی جیسا کہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے اور ترمذی و نسائی وغیرہ میں بھی ہے۔

عوام نے حضرت عثمانؓ کو جامع قرآن مشہور کر رکھا ہے۔

غرض حضرت عثمانؓ کے جامع قرآن ہونے کا جو تواتر عوام میں ہے اس کو تو علماء خود ہی غلط کہتے ہیں۔ باقی رہا حضرت صدیقؓ کا جامع قرآن ہونا جو علماء و محدثین و مورخین کے نزدیک متواتر ہے اب اس کے تواتر کا حال سنئے۔ روایت بخاری وغیرہ میں یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قرآن جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا انھوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ قرآن کو جمع کرا لیجیے، انھوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کہا اور انھوں نے قرآن جمع کرنا شروع کر دیا جس جس کے پاس

جس جس چیز پر لکھا ہوا قرآن ان کو ملا اور پھر صدور الرجال سے بھی یعنی لوگوں کو جو زبانی یاد تھا۔ سورۂ توبہ کی ایک آیت خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملی۔

جمع قرآن کا اتنا بڑا اہم واقعہ جس کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حسب روایت بخاری وغیرہ بمشکل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بار بار اصرار اور تقاضے کے بعد تیار ہوئے اور پھر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی جس کے لئے بمشکل آمادہ ہوئے۔ اور دونوں یہ محسوس کر رہے تھے کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ کام ہم کیونکر کریں۔ یقیناً دوسرے اکابر صحابہ بھی ضرور صلاح مشورہ میں شریک ہوں گے اور رائے قائم ہو جانے کے بعد جس صحابی کے پاس جتنا بھی کسی چیز پر لکھا ہوا ہوگا وہ اس کو لیکر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس آیا ہوگا جس کو جتنا یاد ہوگا اس نے ان کو سنایا ہوگا غرض اگر یہ واقعہ جو بخاری وغیرہ میں جمع صدیقی کا مذکور ہے صحیح ہوتا تو یقیناً ہر صحابی اور ہر صحابیہ اس سے واقف ہوتے یہانتک کہ مراہق بچے بھی اس سے بے خبر نہ ہوتے مگر اس واقعے کی روایت نہ حضرت عمرؓ سے ہے نہ حضرت صدیق اکبرؓ سے نہ خزیمہ سے نہ ابو خزیمہ سے نہ کسی اور صحابی کی۔ بس صرف زید بن ثابت ہی سے یہ واقعہ روایت کیا جاتا ہے، اور کون روایت کرتا ہے؟ عبید بن سباق جو زید بن ثابت کی وفات کے وقت[۱] دو برس سے زیادہ کا کسی طرح بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا اور صرف اسی عبید بن سباق سے تنہا ابن شہاب زہری روایت کرتے ہیں۔

اب دیکھئے واقعہ عہد صدیقی کا۔ اور اتنا بڑا اہم واقعہ مگر آغاز عہد صدیقی سے سو برس تک کے اندر اس واقعے کی اطلاع صرف زید بن ثابت کو تھی اور ان سے صرف ایک دو برس کے بچے نے سنا تھا جس کو اس نے برابر پوشیدہ رکھا کبھی کسی سے نہ کہا۔ یہانتک کہ اپنے بیٹے سے بھی بیان نہ کیا۔ کہا تو اپنے سن کہولت میں صرف ابن شہاب زہری سے۔

کوئی صاحب انصاف ودیانت بتائے کہ جو واقعہ ایسا اہم ہو جس کی اطلاع ساری دنیائے اسلام کو ہونی چاہئے اس کی خبر سو برس تک کی طویل مدت میں صرف ایک ہی شخص کو ہو اور اس سے صرف دو برس کے ایک بچے کو ملے اور وہ اپنے سن کہولت میں صرف ایک ہی شخص سے بیان کرے؟ کیا ایسی خبر کبھی متواتر کہی جا سکتی ہے؟ چاہے اس کے بعد وہ خبر دنیا بھر میں مشہور کر کے اس پر تواتر کا لبادہ اوڑھا ہی کیوں نہ دیا جائے۔

ہاں اس بات کو متواتر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خبر صحیح بخاری، ترمذی، نسائی اور مسند احمد وغیرہ میں ہے۔ چاہے یہ روایت بذات خود موضوع ہو یا جیسی بھی ہو۔

تو صرف بخاری وغیرہ کتب میں اس روایت کا مذکور ہونا اگر قطعیت تواتر رکھتا ہے تو اس سے واقعہ جمع صدیقی تو متواتر نہیں کہا جا سکتا۔

کیا طلسم ہوشربا میں جو قصے جادوگروں کے مذکور ہیں ان قصوں کا طلسم ہوشربا میں مذکور وموجود ہونا قطعی نہیں ہے؟ اور

[۱] دیکھو کتاب "احادیث جمع قرآن اور ان کی بے لوث تنقید" ص ... دن میں

اس کے پڑھنے والوں میں متواتر نہیں ہے؟ مگر کون ذی عقل و صاحب ہوش ہے جو ان قصوں کو بھی قطعی و متواتر کہے۔

تو حضرت عمرؓ کا حضرت صدیق اکبرؓ کو جمع قرآن پر آمادہ کرنا ان دونوں بزرگواروں کے زمانے میں متواتر نہیں صرف ابوخزیمہ یا خزیمہ کے پاس آخر سورہ توبہ کا ملنا ان کے زمانے میں متواتر نہیں۔ غرض تواتر زمانی کا بالکل فقدان۔ اسی طرح اہل مدینہ زید بن ثابتؓ کے سوا سب کے سب اس سے بے خبر اس لئے تواتر مکانی بھی سرے سے معدوم۔ حضرت عمر فاروقؓ و حضرت صدیق اکبرؓ و حضرت زید بن ثابت و حضرت ابوخزیمہ و حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہم یعنی مسند الیہم کا وجود تو ضرور متواتر ہے مگر جس جس بات کی اسناد ان بزرگوں کی طرف اس روایت میں کی گئی ہے نہ وہ مسند باتیں متواتر نہ ان کی اسناد متواتر۔ اور ظاہر ہے کہ صرف مسند الیہ کے متواتر ہونے سے کسی بات کو متواتر نہیں کہا جاسکتا۔ ورنہ ساری جھوٹی سچی حدیثیں متواتر ہو جائیں گی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ان حدیثوں کے مسند الیہ ہیں ان کی ذات مطہر یقیناً متواتر اور قطعی ہے۔ اسی لئے کوئی محدث بھی اس کا قائل نہیں کہ ساری حدیثیں متواتر ہیں۔ بلکہ وہ تواتر میں صرف تواتر اسناد کا اعتبار کرتے ہیں اور وہی اس جمع قرآن والی روایت میں نہیں ہے۔

غرض اس طرح ہر مصنوعی متواتر کی جانچ کی جائے تو نہایت صفائی اور غایت وضاحت کے ساتھ ان تمام مصنوعی متواترات کا ملمع تواتر کا مصنوعی رنگ اڑا کر اس کے کذب و افترا کی اصل حقیقت نمایاں کردی جاسکتی ہے۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ضرورت ہے تو صرف حق طلبی اور دیانت کی ورنہ غلو اور تعصب سے ضرور ہٹ دھرمی پیدا ہو جاتی ہے اور جب طبیعت میں ہٹ دھرمی آگئی تو پھر انسان دن کو رات اور رات کو دن کہنے پر اتر آتا ہے۔

الحمد للہ کہ قرآن مجید کا پہلا دعویٰ جو لاریبیت کا ہے، میں اس کو نہایت واضح طور سے ثابت کرچکا وما توفیقی الا باللہ

اب قرآن مجید کے دوسرے دعوے پر نگاہ انصاف ڈالئے۔

قرآن مجید کا دوسرا دعویٰ

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید

باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکمت و حمد کے مالک کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے۔

یہ دعویٰ دراصل اس بات سے متعلق ہے کہ اس کتاب میں کسی طرح کی تحریف و تصحیف اور کسی قسم کی تغیر و تبدیل نہیں کی جاسکتی کیونکہ اگر کوئی لفظ یا کوئی عبارت کسی نقطہ سے پہلے کسی آیت میں بڑھادی گئی تو یقیناً بڑھانے والا کسی ایسے مفہوم کے پیدا کرنے کیلئے وہ لفظ یا وہ عبارت بڑھائے گا جو مفہوم قرآن پاک کے مقتضائے کلام کے مخالف ہے۔ یا کم سے کم قرآن مبین کا وہ منشا نہیں ہے۔ اور جو بات قرآن کی نہیں ہے اگر قرآن میں داخل کی جائے گی تو وہ یقیناً باطل ہی ہوگی۔

قرآن مجید کی ہر آیت اور اس کا ہر لفظ قرآن ہے۔ جیسا کہ خود قرآن مبین ہی میں ہے۔ وما تتلوا منہ من قرآن ( ) اور جو سورہ یونس ۶۱ کتاب میں سے تلاوت کرتے ہو۔ یعنی قرآن کی ہر آیت اور اس کا ہر لفظ قرآن ہے اور ہر لفظ اور ہر حرف منزل من اللہ ہے

تنزیل من حکیم حمید ہ ہے۔ اس لئے اس کے کسی حرف کے بھی آگے پیچھے سے باطل نہیں آسکتا۔ اگر کسی حرف پر ایک نقطہ بھی بڑھ گیا تو وہ نقطہ باطل ہوا۔ اسلئے ایک نقطہ کا بھی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ کسی حرف یا کسی کلمے یا کسی عبارت کا اضافہ کیا ہوسکتا ہے۔

اسی طرح کوئی عبارت یا کوئی لفظ یا کوئی حرف بلکہ ایک نقطہ بھی اگر اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا اور نکال دیا گیا، یا آگے پیچھے کر دیا گیا تو یقیناً ایسا کرنے والا کسی ایسے ہی مفہوم پیدا کرنے کے لئے کریگا جو مفہوم قرآن کا منشا نہیں ہے۔ پھر بھی قرآن سے زبردستی نکالا جائے تو یقیناً باطل ہی ہوگا اس لئے لایاتیہ الباطل کا زبردست اعلان بانگ دہل پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جس طرح قرآن میں میں کسی طرح کی زیادتی نہیں ہوسکتی اسی طرح کسی طرح کی کمی اور کسی طرح کی تغیر و تبدیل بھی نہیں ہوسکتی۔

اس دعوے کا واضح ثبوت

حقیقت یہ ہے یہ دعویٰ ایک بڑا اہم دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا کر بھی نہیں سکتا۔ کون نہیں جانتا کہ یہود و نصاریٰ نے توریت و انجیل و زبور کو کس طرح مسخ کر کے رکھدیا وید اور اوستا کا حال بھی تاریخ کے ماہرین سے پوشیدہ نہیں مسلمانوں کے یہاں بھی ان کی حدیثیں منافقین و ملاحدہ کے دستبرد سے بچ نہیں سکیں۔ محدثین کی کافی چھان بین کے باوجود ان کے مجلدات موضوع و مشتبہ حدیثوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ مفسدین نے مستقل کتابیں تصنیف کر کر کے بعض ائمہ کی طرف منسوب کر دیں۔ کتنے مفسدین کا مستقل کام یہی تھا کہ جلد بندی و خوش نویسی کا پیشہ اختیار کر کے لوگوں کی کتابوں میں اپنی طرف سے گھٹا و بڑھاؤ کر دیا کرتے تھے۔ جس نے انھیں اپنی کتاب جلد باندھنے کے لئے یا خوشخط صاف کرنے کیلئے دی، بس اس کی کتاب کی شامت آگئی۔

جن منافقین و ملاحدہ کا یہ برتاؤ احادیث رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہو وہ کتاب اللہ کو کب محفوظ چھوڑ سکتے تھے۔ چنانچہ کتاب اللہ کے ساتھ بھی ان منافقین و ملاحدہ نے کیا کچھ نہ کیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مگر آفتاب پر خاک ڈالنے سے آفتاب پر گرد نہیں پڑتی۔ باوجود اس کے کہ اختلاف قرأت کا ایک انبار ان مفسدین نے لگا دیا مگر قرآن مجید حفاظتِ الہیہ کے باعث عہد نبوی سے آج تک صرف ایک ہی قرأت ثابتہ صحیحہ و متواترہ کے ساتھ قرارۃً، تلاوۃً، تعلیماً، تعلماً، حفظاً، کتابۃً اور پھر طباعۃً چلا آرہا ہے۔ اور ساری دنیائے اسلام میں صرف اسی ایک قرأت متواترہ قدیمہ کے مطابق لکھا اور پڑھا جا رہا ہے اور جب سے طباعت کا فن ایجاد ہوا اسی ایک قرأت کے مطابق ہر جگہ چھپ رہا ہے۔

قرآن مجید کے قدیم تاریخی نسخے دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ حضرت عثمان ذی النورینؓ، حضرت علی مرتضیٰ رضہ اور بعض دوسرے صحابہ اور بعض ائمہ اور بعض تابعین و اتباع تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کے مبارک ہاتھوں کے لکھے ہوئے نسخے بھی موجود ہیں مگر ان سبھوں کے درمیان ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہے اور ان نسخوں میں اور آجکل جو دنیائے اسلام میں نسخے مسلمانوں کے مکانوں اور کتب فروشوں کی دکانوں میں موجود ہیں، ان میں کسی طرح کا بھی کوئی اختلاف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض قدیم نسخوں میں نقطے اور اعراب نہیں ہیں مگر جن نسخوں میں نقطے اور اعراب دیئے ہوئے ہیں ان سے ان کو مختلف کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جہاں تمام نقطے دیئے نسخوں میں یعلمون یائے تحتانیہ سے ہے وہاں بے نقطے والے نسخوں میں

Marfat.com

خواہی نخواہی تائے فوقانیہ سے تَعْلَمُون پڑھنا ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی طرح جہاں تمام اعراب دیئے ہوئے نسخوں میں یَحْسَبُوْنَ کی سین کو فتحہ ہے وہاں بغیر اعراب والے نسخوں میں خواہ مخواہ یَحْسِبُوْنَ کی سین کو کسرہ دیکر پڑھنا بے حیائی کے سوا اور کیا کہا جائے گا؟

قرآن مجید کے بعض نسخے

عوام میں مشہور ہے کہ پٹنہ (صوبہ بہار) کی مشہور عالم خدا بخش خان بہادر سی آئی ای مرحوم کی اورنٹیل لائبریری میں قرآن مجید کا ایک ایسا نسخہ ہے جو شیعوں کی روایت کے مطابق چالیس پاروں کا ہے۔ یہ محض افترا اور بہتان ہے۔ اگرچہ ایک مدت ہو گئی مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس نسخے کو دیکھا ہے پورا قرآن مجید صحیح قرأت متواترہ کے مطابق لکھا ہوا ہے۔ آخر کتاب میں کچھ اوراق پر شیعوں کے مطابق روایات سے نکال نکال کر کچھ الفاظ اور کچھ عبارتیں لکھ کر ان کی نشاندہی کی ہے کہ یہ لفظ فلاں سورہ میں فلاں جگہ پر فلاں آیت میں فلاں لفظ کے بعد تھا جس کو نکالنے والوں نے نکال دیا۔ اور فلاں سورہ میں فلاں جگہ یہ عبارت بھی تھی وغیرہ ذلک۔ اور بعض طویل عبارتیں بھی ہیں جن کا نام سورہ ولایت وغیرہ رکھ دیا ہے۔ غرض یہ سارا اضافہ چند اوراق پر اخیر میں ہے نفس قرآن مجید میں ان اضافوں کو داخل کرنے کی ہمت اس کاتب خبیث کو بھی نہ ہوئی۔

اسی طرح ایک نسخے کا ذکر خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے اخبار منادی میں کیا تھا جس کو بیس برس کم و بیش ہوئے کہ وہ نسخہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ترتیب دی ہوئی آیتوں اور سورتوں کے مطابق ہے۔ میں نے اس نسخے کو خود دیکھا نہیں ہے کہ میں اس کی حقیقت پر روشنی ڈالوں۔ مگر عقل و درایت سب سے بڑھ کر ہے عقل سلیم اس شخص سے جو اس کو حضرت علیؓ کا ترتیب دیا ہوا نسخہ یقین کرے بیٹھا ہے حسب ذیل سوالات کرتا ہے۔

(۱) یہ نسخہ جس کے پاس ہے، اس کے پاس کس سلسلے سے پہنچا؟

(۲) اس نسخے پر حضرت علی مرتضیٰؓ، ان کے صاحبزادوں، ان کے پوتوں اور پھر ان کی اولاد کے دستخط اور مہریں بھی ہیں یا نہیں؟ نہیں ہیں تو کیوں؟ اور اگر ہیں تو ان کی صحت کی کیا دلیل ہے؟

(۳) حضرت علی مرتضیٰؓ کی شہادت سنہ ۴۰ھ میں ہوئی تھی۔ اگر یہ نسخہ انھیں کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے تو یقیناً سنہ ۴۰ھ کے پہلے کا لکھا ہوا ہو گا۔ اس نسخے کا ذکر ان کی اولاد اور احفاد میں سے کبھی کسی نے کہیں کیا یا نہیں؟ نہیں کیا، تو کیوں؟ اور کیا تو کہاں کیا؟ کس کتاب میں اس کا ذکر ہے؟

(۴) حضرت علی مرتضیٰؓ کے متعلق یہ روایت ناقابل اعتبار ضرور ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ جب خلیفہ منتخب ہو چکے تو حضرت علیؓ گوشۂ عزلت میں بیٹھ گئے اور نماز کے وقتوں کے سوا اور کسی وقت گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے کسی نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ وہ آپ کی خلافت کو پسند نہیں کرتے اس لئے گھر سے باہر نہیں نکلتے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان سے پچھوا بھیجا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک قرآن جمع نہ کرلوں گا اپنی چادر نہ اوڑھوں گا بجز نماز کے وقتوں کے۔ میں جمع قرآن میں

منہمک ہوں اسلئے باہر نہیں نکلتا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ تم بہت اچھا کام کررہے ہو۔ محدثین نے اس روایت کو صحیح مان کر اس کا مطلب ان میں سے کسی نے یہ بتایا کہ جمع کرنے کے معنی ہیں یاد کرنا۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حافظِ قرآن نہ تھے اسلئے پورا قرآن حفظ کرکے اپنے سینے میں جمع کررہے تھے۔ کسی نے کہا کہ ایک نسخہ اپنے لئے لکھ رہے تھے، قرات متواترہ جس طرح سارے صحابہؓ پڑھتے تھے اسی کے مطابق۔ مگر جن لوگوں کا رجحان تشیع کی طرف تھا انھوں نے کہا کہ حضرت علیؓ ترتیب نزول کے مطابق قرآن جمع کررہے تھے۔ یعنی جو آیت سب سے پہلے اتری تھی اس کو سب سے پہلے جو اس کے بعد اتری اس کو اس کے بعد، جو اس کے بعد اتری تھی اس کو اس کے بعد۔ وھلم جرًّا۔ یہاں تک کہ الیوم اکملت لکم دینکم والی آیت پر انھوں نے قرآن کو ختم کیا تھا۔ مگر یہ لوگ یہ نہیں بتاتے کہ آخر وہ نسخہ ہوا کیا؟ البتہ شیعوں کے ہاں یہ روایت ہے کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ زید بن ثابتؓ سے قرآن جمع کرانے لگے تو حضرت علیؓ اپنا جمع کیا ہوا قرآن ان کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہی صحیح قرآن ہے جس کو ہم جمع کرچکے ہیں، اب پھر زید بن ثابتؓ سے کیوں جمع کرا رہے ہیں؟ مگر ان کے جمع کئے ہوئے قرآن کو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے قبول نہ کیا اور اس کو لینے سے انکار کیا اور زید بن ثابت سے قرآن کو جمع کراتے رہے تو حضرت علیؓ نے کہا کہ جب تم لوگ اس صحیح نسخے کو قبول نہیں کرتے تو پھر اس نسخے کو کبھی نہ دیکھوگے اور نہ امام آخر الزماں کے آنے سے پہلے کوئی مسلمان اس کو دیکھے گا۔ اب وہی جب قیامت کے قریب آئیں گے تو اس کو نکالیں گے اور اس کی اشاعت کریں گے۔ اسی لئے حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں اپنے خاص عقیدتمندوں میں بھی اپنے اس جمع کردہ نسخے کی اشاعت نہیں فرمائی اور نہ کسی کو دکھایا۔

شیعوں کی حدیث کی کتابوں میں ان کے بعض ائمہ کی طرف منسوب اس قسم کی روایتیں ہیں[1] کہ فلاں سورہ میں فلاں جگہ پر فلاں عبارت تھی یا فلاں لفظ تھا۔ تو ان کے بعض متقدمین نے پوچھا کہ کیا ہم لوگ اب اسی طرح اس اضافے کے ساتھ پڑھا کریں؟ تو ان کے ائمہ نے سختی کے ساتھ منع کیا اور کہا کہ جب تک امام آخر الزماں نہ آئیں اسی موجودہ مروجہ قرأت کے مطابق قرآن مجید پڑھو۔ اس میں کسی جگہ بھی کمی بیشی نہ کرو۔ جب امام آخر الزماں آئیں گے تو وہی اصلی اور صحیح قراءت کے مطابق قرآن شائع کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ائمہ کے بھی ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآن کے نسخے نجف، کربلا، کاظمین وغیرہ شیعوں کے متبرک مقامات میں وہاں کے متولی مجتہدوں کے پاس موجود ہیں۔ مگر وہ نسخے ایک حرف اور نقطے کا بھی اختلاف اس دائر و سائر قرآن مجید سے نہیں رکھتے تو پھر یہ نسخہ جس کا ذکر خواجہ حسن نظامی صاحب نے کیا تھا کہاں سے آگیا؟ غرض یہ نسخہ اہل سنت کے نزدیک افترائی نسخہ ہی ہے، شیعوں کے عقیدے کے مطابق بھی کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

غرض قرآن مجید کے تمام قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید اور درمیانی زمانوں کے نسخوں کا غیر مختلف فیہ ہونا، دنیا بھر کے سارے اگلے پچھلے اور موجودہ حفاظ کا ایک ہی طرح قرآن کا پڑھنا، قرآن کے اس دعوے کی زبردست تصدیق کررہا ہے کہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔

---

[1] دیکھئے شیعوں کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ معتبر حدیث کی کتاب اصول کافی م۶۷

اس جگہ بیجا نہ ہوگا اگر میں قرآن مجید کے کچھ نایاب تاریخی نسخوں کی ایک فہرست پیش کر دوں جو دنیا کے بعض مشہور کتب خانوں
ں اس وقت موجود ہیں۔ یہ فہرست رسالہ معارف اعظم گڈھ دار المصنفین کے آرگن ۶۲ جلد ۱۶ سے میں نے کسی زمانے میں نقل کرلی تھی
ب یہ نقل بھی کرم خوردہ اور کسی قدر ضائع شدہ میرے پاس ہے لیکن وہ رسالہ معارف یہاں میرے پاس موجود نہیں ہے اور اس کا حاصل
رنا بھی مشکل ہے۔ افسوس یہ ہے کہ صاحب مضمون کا اسم گرامی ہی پھٹ کر غائب ہوگیا ہے جس کا مجھ کو سخت افسوس ہے۔ بہر حال
فسِ مضمون اور اصل فہرست ایک حد تک محفوظ ہے جس کو میں طوالت کو حذف کرکے یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔

قرآن مجید کے بعض نایاب و قدیم نسخوں کی فہرست

یہ مضمون چار قسم کے مصاحف پر منقسم ہے۔ اول وہ نسخے جنھیں صاحب مضمون نے کتب خانوں کی فہرست سے چنا ہے۔ دوم
ہ نسخے جن کو مورخین نے تواریخ میں ذکر کیا ہے۔ سوم وہ نسخے جو خاص کسی شخص کی ملک ہوں۔ چہارم جن کو صاحب مضمون نے خود اپنی
یاحت کے موقع پر کتب خانوں میں معائنہ کیا۔

پہلی قسم کے مصاحف

(۱) خاص حضرت امیر المومنین عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا مصحف۔ اس
مصحف نے شاہانِ مغلیہ کے کتب خانوں کو بھی شرف بخشا ہے۔ آخر صفحہ میں اکبر بادشاہ کی مہر اور دستخط
ی ہیں۔ اور دوسرے سرداروں کی مہریں بھی ہیں۔ یہ نسخہ متبرکہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے انڈیا آفس لندن کی
لائبریری کی زینت بڑھا رہا ہے۔

یہ مکمل نسخہ نہیں ہے صفحات ۱۸۱ ہیں۔ اور ہر صفحے میں ۱۶ سطریں سورتوں کے نام ٹیڑھے خطوط میں لکھے ہوئے ہیں اور ہر آیت میں
ایک ایسا نشان ہے جو ایک قدیم مغربی حرف کی شکل میں ہے۔ اور ہر دو سو آیت کے بعد حاشیے پر ایک نشان ہے۔ آخر کتاب میں کاتب کا
نام یوں لکھا ہوا ہے۔ کتبہ عثمان بن عفان۔ خط کوفی سے قریب تر ہے۔

(۲) خاص امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا نسخہ۔ ناتمام، چند سورتیں، ۶۴ صفحات، ہر صفحے میں
پانچ سطریں بخط کوفی، مگر مدور لکھا ہوا ہے۔ ہر دو سطروں کے درمیان بہت زیادہ بعد ہے اور درمیان میں حرکات کی جگہ سرخ نقطے ہیں
سنہرے نقوش سے آیات بنی ہیں۔ دس دس آیتوں کے بعد ایک سنہرا بڑا نقش ہے۔ عنوان میں سورتوں کے ناموں کی جگہ خالی ہے۔ بعد میں
کسی نے حواشی پر دبیز کاغذ وصل کرکے طلائی کاموں سے مرصع و مزین کردیا ہے اور ابتداء و آخر صفحات کو اعلیٰ درجے کے نقش و نگار
سے آراستہ کردیا ہے۔ اخیر میں خاتمہ پر صدق اللہ العلی العظیم لکھا ہوا ہے جو اب نقوش کے اندر نظر آتا ہے اور اس کے بعد
بالکل اخیر میں کتبہ علی بن ابی طالب لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ تیمور کے ساتھ ہندوستان آیا پھر لاہور کے کسی کتب خانے میں پہنچا، یہاں سے
پیرس پہنچا اور اب لندن کے انڈیا آفس میں زینت بخش کتب خانہ ہے۔

(۳) دو سو صفحات کا ایک نامکمل نسخہ بخط کوفی ہے، ہر صفحے میں دس سطریں حرکات ظاہر کرنے کے لئے سبز و سرخ نقطے ہیں۔
آیات سنہرے نقوش سے بنائے گئے ہیں۔ ہر دس آیت پر ایک بڑا نقش ہے۔ جا بجا حروف مٹے جارہے ہیں۔ آخر میں کاتب کا نام یوں

لکھا ہے کتبہ علی بن حمدان[1]۔ اس نسخے کو دو شاہانِ صفویہ اسمٰعیل اول اور عباس اول کے کتب خانوں میں رہنے کا موقع بھی ملا ہے پھر ہندوستان میں اکبر بادشاہ کے کتب خانے کی زینت رہا ہے پھر شاہ جہاں کے کتب خانے میں رہا، عنایت خاں، فاضل خاں وغیرہ عہدیداروں کی مہریں بھی سلاطین کے مہروں کے بعد ہیں۔ اعتماد خاں منصب دار کی مہر بھی ہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کتب خانے کو تحفہ دیا اور اب لندن کے انڈیا آفس کے کتب خانوں کو زینت بخش رہا ہے۔

(۴) یہ نسخہ خاص حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ یہ بھی مکمل مصحف نہیں۔ چند سورتیں ہیں بخط کوفی۔ صرف باون[52] صفحات ہیں۔ ہر صفحے میں تین سطریں ہیں اور چوب خط ترچھی لکھی ہوئیں۔ اس میں "لام الف" لا کو ایک نئے طریق سے لکھا ہے سرخ نقطوں سے حرکات کے نشانات ہیں سنہرے نقوش سے آیات ہیں۔ حواشی اعلیٰ درجے کے مطلّٰی و مذہّب ہیں۔ اخیر ورق پر بھی خط کوفی میں لکھا ہوا ہے جو متن کے قریب ہے نقوش کے اندر ہی کاتب کا نام ہے کتبہ حسن بن علی۔ یہ نسخہ بھی انڈیا آفس لندن ہی میں موجود ہے۔

(۵) یہ نسخہ متبرکہ بھی حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہے۔ یہ بھی چند سورتیں ہیں بخط کوفی چوب خط لمبے حرفوں میں چھیالیس صفحات، ہر صفحے میں نو سطریں۔ حرکات سرخ، سبز، زرد، اور نیلے رنگوں سے بنے ہیں۔ آیات زرافشاں ہیں۔ دس دس آیتوں پر طلائی کام کا ایک بڑا نقش ہے۔ سورتوں کے نام ہر سورہ کے عنوان پر زرافشاں زمین پر لکھا ہوا ہے۔ کاتب کا نام کاتب کے قلم سے نہیں ہے۔ مگر آخری صفحے پر کسی دوسرے کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے کہ یہ فلاں کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے یہ نسخہ بھی انڈیا آفس ہی میں ہے۔

(۶) صرف چند سورتیں ہیں جو سیستان میں ۵۰۵ھ میں لکھی گئی تھیں۔ کاتب کا نام نہیں ہے۔ یہ نسخہ اس وقت پیرس کے بیبلوتھیکا نیشنل کے کتبخانہ میں موجود ہے۔

(۷) (ا) یاقوت مستعصمی (متوفی ۶۹۸ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکمل قرآن مجید۔ یہ بھی بیبلوتھیکا نیشنل پیرس کے کتبخانے میں ہے۔ یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چار مکمل نسخوں کا ذکر یہاں پر کیا ہے ایک وہی جو ابھی اوپر گذرا۔ اور تین نسخے اور ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۸) (ب) پٹنہ اورینٹل لائبریری میں بھی ایک مکمل مصحف ہے۔

(۹) (ج) مدراس احتشام الدولہ کے کتب خانے میں بھی ایک مکمل مصحف ہے۔

(۱۰) (د) لکھنؤ واجد حسین مرحوم کتب فروش کے ذخیرے میں نصف اول پندرہ پارے تک ہے۔ نہایت مطلّٰی و مذہّب۔ ہر صفحے پر ۱۳ سطریں اول، درمیان اور آخر کی سطریں چوب خط ہیں۔ خط نسخ میں ۶۸۱ھ میں لکھا گیا۔

(۱۱) (ہ) اسی نمبر ۱۰ والے نسخے کا دوسرا حصہ ہے یعنی آخر کے پندرہ پارے۔ یہ نسخہ واجد حسین صاحب کے بھائی عبد الحسین صاحب کے پاس تھے۔ بالکل اسی پہلے حصے کی طرح خط نسخ میں مطلّٰی و مذہّب۔

---

[1] غالباً رائے مہملہ کو دال مہملہ پڑھکر حمدان سمجھ لیا گیا۔ اور نہ یہ "علی بن حمران" ہوں یعنی حضرت حمران بن جابر الیمامی صحابی کے صاحبزادے۔ واللہ اعلم ۱۲ تمنا عفی عنہ

صاحب مضمون نے واجد حسین صاحب سے ڈھائی سو روپے ہدیہ دیکر ان کے پاس والے نسخے کو حاصل کرنا چاہا تھا۔ بشرطیکہ اسی طرح ان کے بھائی بھی ڈھائی سو کے ہدیہ پر دوسرا حصہ دیدیں نگران کے بھائی نے پانچ سو کی رقم طلب کی۔ اس لئے صاحب مضمون ان دونوں حصوں کو حاصل نہ کرسکے۔ چونکہ وہ اس وقت اتنی رقم دے نہیں سکتے تھے۔ اب غالباً وہ دونوں حصے دونوں صاحبوں کے ورثہ کے پاس موجود ہوں، واجد حسین مرحوم کا تو انتقال ہوگیا۔ عبدالحسین کا حال معلوم نہیں۔

(۱۲) سلطان شہید ٹیپو سلطان کی تلاوت کا قرآن مجید۔ اس کے شروع میں سورتوں کی فہرست بھی ہے۔ اور آخر میں دعائیں بھی۔ صفحہ ۲۵ سے اصل قرآن مجید شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۵۲۰ پر قرآن مجید ختم ہوتا ہے۔ بے حد خوشخط اور نہایت مطلّی و مذہب ہے۔ خط نسخ میں ہے سال کتابت اور نام کاتب کا پتہ نہیں، یہ نسخہ بھی اب انڈیا آفس لندن میں ہے۔

(۱۳) یہ نسخہ احمد الانصاری المدنی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جو دسویں صدی ہجری میں زندہ تھے۔ بخط نسخ خوشخط ۹۹۵ھ کی تحریر ہے۔ فارسی ترجمہ بھی بین السطور بخط نستعلیق خوشخط لکھا ہوا ہے۔ غدر کے وقت لکھنؤ میں ایک شخص اس قرآن مجید کو لئے بھاگا جا رہا تھا کہ مارا گیا۔ مرحوم شہید نے قرآن کو نہ چھوڑا اور سینے سے لگائے رہا کہ روح نکل گئی۔ یہ قرآن بھی اب انڈیا آفس میں ہے۔

(۱۴) نامکمل، بہت قدیم، بخط کوفی، چمڑے کے کاغذ پر (۱۲۱) صفحات خوب خط کتابت گھنی۔ یوروپین ماہرین آثار قدیمہ اس کو بہت قدیم ترین نسخہ تصور کرتے ہیں برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ غرض یہ نسخہ متبرکہ بھی لندن ہی پہنچا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مکمل مصحف کے اجزا ہیں۔ باقی اجزا ضائع ہوگئے۔

(۱۵) یہ بھی ۱۴ کی طرح قدیم ترین اور اہم تر نسخہ ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک ہے چمڑے ہی کے کاغذ پر لکھا ہوا ہے اور خط کوفی ہی میں ہے، کتابت بھی گھنی ہے مگر ۱۴ کا بقیہ حصہ نہیں ہے کیونکہ اس کی کتابت لمبائی میں ہے۔

خدیو مصر کے کتب خانے کے مصاحف

(۱۶) نصف اول مصحف شریف ہرن کی کھال پر بخط کوفی لکھا ہے گویا فن رقِ منشور کا نمونہ ہے طلا کاری سے مزین ہے۔ (۲۰۹) اوراق ہیں اور ہر صفحے میں انیس ۱۹ سطریں دو لوح میں مجلد ہیں۔ خرمائی چھال اور تنے کی جلدیں ہیں۔ یعنی جلد بھی اسی وقت کی بندھی ہوئی ہے۔ آخر میں بخط معمولی لکھا ہوا ہے "الامام جعفر الصادق" حضرت ممدوح کی ولادت مدینے میں ۸۳ھ میں ہوئی مطابق ۷۰۲ء اور وفات ۱۴۸ھ میں مطابق ۷۶۵ء مدینے ہی میں ابو جعفر المعتمد کے عہد خلافت میں ہوئی۔ آخری صفحے پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔ ان ھذا النصف بخط الامام الصادق عبید الله الامین جعفر بن الامام محمد الباقر بن الامام ابی الحسن علی زین العابدین بن الامام السبط الحسین بن الامام علی بن ابی طالب کرم الله وجهه و رضی عنه اوراق ۳۳۲ ہیں اور ہر صفحے میں ۱۸ سطریں۔ اوراق بہت بوسیدہ ہوگئے ہیں۔ بعض اوراق غایت بوسیدگی سے غائب ہوگئے ہیں تو نئے سفید اوراق اس کی جگہ لگا دیئے گئے ہیں اور لکھا ہے کہ ۳۶۵ھ میں احمد بن اسکاف نے وراقی کی۔

(۱۷) و (۱۸) و (۱۹) و (۲۰) یہ چاروں نسخے مذکورہ بالا نسخوں سے بھی قدیم ہی معلوم ہوتے ہیں بخط کوفی لکھے ہوئے ہیں

Marfat.com

اور ہرن کی کھال ہی پر۔ سال کتابت اور کاتب کے نام مرقوم نہیں ہیں۔ مگر ان کی قدامت اور صورتِ حال بتا رہی ہے کہ یہ چاروں نسخے عہد نبوی یا عہد خلفائے راشدین کی یادگاریں ہیں اور صحابہؓ ہی کے مبارک ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ صاحبِ مضمون نے اس کو واضح نہیں کیا ہے کہ یہ چاروں نسخے مکمل ہیں یا نامکمل۔ مگر نامکمل ہوتے تو اس کو ضرور لکھ دیتے ورنہ صرف چار نسخے لکھنے کے معنی یہی ہیں چاروں مکمل نسخے ہیں۔

(۲۱) محمد بن عمر الطنبومی الشافعی الازہری نے یہ مصحف وزیر اعظم مصر الحاج محمد بن علی پاشا کے حکم سے ۱۲۴۷ھ میں لکھا تھا۔

(۲۲) ہرن کی کھال پر بخط کوفی ابتدائی رسم خط میں بغیر اعراب اور نقطوں کے یہ مکمل مصحف ہے۔ حضرت امیر المومنین عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی تلاوت میں رہتا تھا۔ شہادت کے وقت یہی نسخہ ان کے سامنے تھا۔ ان کے پاک خون کے داغ بھی اس وقت تک اس کے اوراق پر موجود ہیں۔ خلیفہ مقتدر کے کتب خانے سے برآمد ہوا۔ اس پر بنت ابوبکر بن عبد العزیز ابن مروان کا نام بھی ہے۔ تعزیری نے بھی اس نسخہ کا ذکر کیا ہے اور اس کو وہی نسخہ بتایا ہے جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پاک خون ہے۔ جامع عتیق مصر میں موجود ہے ایک منقوش و مرصع لکڑی میں لگا دیا گیا ہے۔

(۲۳) بخط مغربی طلاکار اور الوان سے مرصع سلطان محمد کے کتب خانے کیلئے ۱۱۴۲ھ میں لکھا گیا۔

(۲۴) یہ نسخہ بخط محمد اولاف کاتب (۲۶۳) ورقوں میں ہے۔ کہنگی سے کیڑوں نے جا بجا سوراخ کر دیئے ہیں۔

(۲۵) بخط مغربی۔ کاتب مبارک بن محمد کوری (۲۴۰) اوراق پر مشتمل ہے ہر صفحے میں ۱۸ سطریں ہیں۔

(۲۶) بخط مغربی۔ ۱۲۶۲ء کی تحریر ہے۔ اوراق (۱۲۹)۔ ہر صفحے میں ۱۶ سطریں۔ صرف نصف ثانی۔ بقیہ نصف کے اوراق ۱۱۲۔ سطریں مختلف۔ کاتب کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

(۲۷) بخط مغربی سورۂ مریم سے اخیر تک مطلّی و مذہب زرافشاں اوراق ۱۱۲ سطور مختلف کاتب کا نام اور سال کتابت لکھا نہیں ہے۔

(۲۸) بخط مغربی۔ صرف نصف اول وہ بھی ناتمام اوراق ۱۰۹، سطریں ۱۶۔ کاتب کا نام اور سال کتابت مذکور نہیں۔

(۲۹) بخط مغربی۔ صرف سورۂ جمعہ سے آخیر تک۔ اوراق ۲۲۔ سطریں ۱۹۔

(۳۰) یونس بن محمد اندلسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکمل نسخہ اوراق ۶۷، سطور ۹۔ سال کتابت ۱۱۶۶ھ۔ (اوراق کی تعداد کم ہے ممکن ہے کہ سینکڑے کا ہندسہ لکھنے میں چھوٹ گیا ہو، یا خفی کتابت بہت گھنی ہو یا تقطیع بڑی ہو)۔

دولتِ فاطمیہ کے مصاحف

(۳۱) جلی قلم، مسعود بن الکاتب الاصفہانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ جنھوں نے اس کو غرۂ ذیقعدہ ۵۵۵ھ میں تمام کیا۔ ابتدائی چند اوراق، اور آل عمران کا ایک ورق کرم خوردہ ہے۔ محلّٰی بالذہب والالوان۔ اوراق ۴۱۰، سطور ۱۱۔

(۳۲) جلی قلم، محلّٰی بالذہب والالوان۔ اوراق ۳۴۱ سطور ۱۱۔ لیکن سورۂ بروج سے آخر تک کرم خوردہ ہے۔

Marfat.com

اولِ قرنِ رابع کے اجزائے مکتوبہ

(۳۳) سورۃ الحجر بخط نسخ۔ کاتب ابو علی محمد بن مقلہ بانیِ خطِ نسخ و دیگر خطوط متوفی ۳۲۸ھ یہ نسخہ ۳۰۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ہر سطر کے نیچے فارسی ترجمہ بھی ہے۔ جدول مطلا و مذہب اور بہت مرصع ہے اوراق ۱۶، سطور ۹۔

دولتِ ایوبیہ کے زمانے کے مصاحف مکتوبہ

(۳۴) اس نسخے کو عبد الرحمن بن ابو الفتح نے ۵۶۶ھ میں ملک معظم ابن ابی المظفر سعد بن زنگی اتابک کے کتب خانے کے لئے لکھا تھا خط نسخ ہے۔ اس کے اول میں ایک رسالہ ہے جس میں قرأت عشرہ کا بیان ہے اور اس کے اصطلاحات ہیں۔ اور ہر سورہ کے شروع میں تعداد آیات بیان کیا ہے اور مکی ہے یا مدنی۔ یہ بھی مذکور ہے اور تعداد کلمات و حروف کا بھی ذکر ہے۔ اوراق ۴۹۰ سطور ۱۱، مطلا و مذہب بھی ہے۔

(۳۵) اس نسخہ کو اسمعیل بن ابراہیم بن احمد نے ۶۳۵ھ میں بخط جلی لکھا ہے، ہر آیت محلی بالذہب ہے اور کل سورتوں کی ابتدا بھی مرصع و مزین ہے۔ بعض اوراق نمی سے مرطوب اور خستہ ہو گئے ہیں۔ اوراق ۳۹۵ سطور ۱۱۔

(۳۶) یہ نسخہ مسعود بہ محمد بن مسعود الخطاط الاصفہانی نے ۵ ذیقعدہ ۶۰۳ھ کو معمولی خط میں لکھ کر تمام کیا تھا۔ دو نسخوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ سورۂ کہف تک، دوسرا آخر قرآن تک۔ نصف اول کے اوراق ۲۹۱، اور نصف ثانی کے (۳۰۸)۔ سطور دونوں میں ۹۔ دونوں نسخوں کے ابتدائی حصے مطلا و مذہب ہیں۔

مصاحف مکتوبہ ممالک بحریہ کے عہد کے

(۳۷) یہ نسخہ بخط ثلث جلی قلم سونے کے پانی سے لکھا گیا ہے۔ سلطان ملک ناصر محمد قلاون نے ۷۳۰ھ میں اس کو وقف کیا تھا (لکھا ہوا یقیناً اس سے پہلے کا ہے) سطریں ۸ اوراق ۳۰۷ آخری ورق کے اوپر کا حصہ کچھ خراب ہو گیا ہے۔

(۳۸) جلی قلم مطلا و مرصع اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلطان حسن نے اس کو وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۷۴، بعض اوراق خراب ہو گئے ہیں۔

(۳۹) جلی قلم۔ محلی بالذہب والالوان۔ اس نسخے کو سلطان ملک اشرف کی والدہ ماجدہ (خوند برکہ) نے ۷۶۹ھ میں وقف کیا تھا (لکھا ہوا پہلے کا ہے) سطریں ۱۱، اوراق ۳۲۰۔

(۴۰) جلی قلم مطلا و مذہب و مرصع۔ سلطان اشرف ابو المظفر شعبان بن المعز اشرف حسین بن السلطان ناصر محمد بن قلاون صالحی نے شعبان ۷۷۰ھ میں اس کو وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۴۱۰

(۴۱) اس نسخے کو بھی ملک اشرف ابو المظفر نے ماہ ذیقعدہ ۷۶۹ھ میں وقف کیا تھا اور اس کو ۷۵۶ھ میں خلیل بن محمد بن عبد الرحمن الحنفی نے لکھا تھا۔ یہ بھی مطلا و مرصع ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۴۱۰ ہیں۔ (عجب کیا ہے کہ اس کے اوپر والا نسخہ ۴۰ بھی خلیل بن محمد الحنفی ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ واللہ اعلم۔

(۴۲) اس نسخے کو بھی ملک اشرف نے ۷۷۰ھ میں وقف کیا تھا۔ دو جلدوں میں ہے۔ سطریں ۷ ہیں۔ جلد اول سورۂ اسری تک ہے

Marfat.com

جس کے اوراق ۳۵۹ ہیں۔ اور جلد دوم آخر تک ہے جس کے اوراق ۴۲۵ ہیں۔ دونوں جلدیں مطلاّ و مرصع ہیں۔

(۴۳) اس کو بھی سلطان ممدوح نے ۷۸۸ھ ماہ شعبان میں وقف کیا تھا۔ خط جلی ہے علی بن محمد المکتب الاشرفی نے ۷۷۴ھ میں اس کو لکھا تھا محلی بالذہب والالوان ہے ہر اول سورہ میں نام اور تعداد آیت خط کوفی میں ہے۔ اور تعداد کلمات و حروف خطِ ثلث میں۔ اخیر میں طلاسے عدد آیات اور عدد احکام امر و نہی و وعد و وعید و قصص و اخبار و عبر و امثال و حلال و حرام و دعاء و تسبیح اور آیات ناسخ و منسوخ لکھا ہوا ہے بعض اوراق خستہ ہو گئے ہیں۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۱۷ ہیں۔

(۴۴) یہ نسخہ بخط ثلث اور نسخ میں لکھا گیا ہے۔ بیان ہے کہ اسے امیر سیف الدین الجامعی الیوسفی نے وقف کیا تھا۔ مطلاّ و مذہب ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۵۶۰ ہیں۔

(۴۵) اس کو محمد المکتب الشہابی نے المعز الاشرف کے حکم سے ۷۷۶ھ میں لکھا تھا۔ جلی قلم ہے۔ محلی بالذہب والالوان ہے یہ نسخہ مصحف الکاف کے نام سے مشہور ہے۔ کسی قدر کرم خوردہ بھی ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۲۹۳ ہیں۔

(۴۶) بخط نسخ بدست یاقوت مستعصمی ۶۹۰ھ کی کتابت ہے محلی بالذہب والالوان۔ سطریں ۱۷، اوراق ۱۹۲ ہیں۔

(نوٹ) یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے ۷ سے ۱۱ تک پہلے مذکور ہو چکے ہیں یہ چھٹا نسخہ ہوا۔ اور ایک مشتبہ نسخہ ۷۵ میں آئے گا اور ۱۰۶ اور ۱۰۷ میں بھی آئے گا۔

(۴۷) یہ نسخہ شیخ عبد الفتاح العریف کے ترکے کا گویا ایک تمسک ہے۔ خط جلی ہے مطلا و مرصع ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۴۰۹۔

(۴۸) معمولی قلم۔ ہر سطر کے نیچے تفسیر۔ سطریں ۱۳، اوراق ۳۹۱۔

(۴۹) بخط جلی۔ احمد بن محمد بن کمال الانصاری نے جو شہر قاہرہ کے طبیب تھے ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں اس کو لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک رسالہ رسم مصحف میں کاتب موصوف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مطلا و مذہب ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۱۸ ہیں۔

(۵۰) بخط ثلث محمود بن حسین بن علی النجوانی نے ۷۶۲ھ (۱۳۶۰ء) میں اس کو لکھا تھا مطلا و مرصع ہے سطریں ۱۳ اوراق ۳۵۰ ہیں۔

(۵۱) جلی قلم۔ موسیٰ محمد بن الحسن التنوخی المالکی الاشرفی نے ربیع الاول ۷۷۶ھ (۱۳۷۴ء) میں بمقام قاہرہ لکھا تھا جسکو ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) میں سید احمد بن ادریس الحسینی نے مقام امام شافعی میں وقف کیا۔ مذہب و مرصع ہے۔ سطریں ۹، اوراق ۲۹۷ ہیں۔

(۵۲) جلی قلم ہے عبد اللہ الشافعی نے ۷۴۰ھ (۱۳۳۹ء) میں لکھا تھا۔ مطلا و مرصع ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۴۸ ہیں۔

(۵۳) ۷۴۲ھ (۱۳۴۲ء) میں بخط ثلث لکھا گیا۔ مذہب و مرصع بھی ہے ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں محمد الجرانہ نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۷، اوراق ۲۴۹۔

(۵۴) جلی قلم۔ حسن بن قاسم الجعفری نے رمضان ۷۲۳ھ (۱۳۲۲ء) میں اس کو لکھا تھا محلی بالذہب ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۵۰۔

(۵۵) جلی قلم۔ عبد الرحمٰن بن صانع نے ساٹھ دنوں میں اس قرآن مجید کو لکھا ۶ ذی الحجہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) کو کتابت سے فراغت حاصل کی۔ محلی بالذہب والالوان ہے۔ سلطان برقوق نے اس کو وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۵۹۔

Marfat.com

(۵۶) خط ثلث بخط طلا۔ اور مسطر بخط سیاہ۔ محلی بالذہب والالوان سطریں ۱۰، اوراق ۲۵۵۔ اسکو بھی سلطان برقوق نے وقف کیا تھا۔

(۵۷) اس کو ۸۱۴ھ (۱۴۱۱ء) میں عبدالرحمن بن صائغ نے جلی قلم سے لکھا تھا۔ اول و آخر و اوائل سورہ و آخر آیات محلی بالذہب ہے اس کو سلطان ناصر فرح بن سلطان برقوق نے وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۰، اوراق ۴۰۸۔

(۵۸) اس کو سلطان ملک ناصر فرح بن سلطان برقوق کے کتب خانے کیلئے عبدالرحمن بن صائغ نے ماہ رمضان ۸۱۴ھ (۱۴۱۱ء) میں جلی قلم سے لکھا تھا۔ محلی بالذہب والالوان ہے سلطان المؤید شیخ ابوالنصر نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۲۵۴۔

(۵۹) موسیٰ بن اسمٰعیل کاتب الحنفی المعروف بالجہینی نے ماہ شعبان ۸۲۰ھ (۱۴۱۷ء) میں اس کو جلی قلم سے لکھا تھا۔ محلی بالذہب والالوان ہے۔ الملک المؤید شیخ ابوالنصر نے اس کو بھی وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۲۴۔

(۶۰) اس نسخے کو ملک اشرف ابوالنصر قایتبائی کے کتب خانے کے لئے جانم سیفی جان بیک رو دار الکبیر نے جلی قلم سے لکھا تھا بہت بڑی تقطیع ہے۔ کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔ سطریں ۱۰، اوراق ۳۲۸۔

(۶۱) جلی قلم، محلے بالذہب والالوان سنہری جلد سطریں ۱۲، اوراق ۳۰۵

(۶۲) بخط نسخ۔ سعد الحافظ سرائی نے ۸۰۶ھ (۱۴۵۵ء) میں لکھا۔ محلی بالذہب والالوان ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۲۹۸۔

(۶۳) محمد آفندی الشہیر لغرابی روزنامچی کاتب دیوان مصر کی لڑکی عائشہ نے ماہ صفر ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں اس کو وقف کیا تھا۔ سال کتابت ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) ہے بخط ثلث لکھا ہوا ہے محلی بالذہب والالوان بھی ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۳۴۸۔

(۶۴) ۸۳۷ھ (۱۸۳۳ء) میں کسی نے اس کو لکھا تھا۔ ولی الدین آفندی خلوصی جو محمد علی پاشا کے کتب خانے کا کاتب تھا اس نے اس کو ۱۲۳۳ھ (۱۸۰۸ء) میں وقف کیا۔ محلے بالذہب اور مرصع ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۹۔

(۶۵) جلی قلم۔ ۸۷۹ھ (۱۴۷۴ء) میں اس کو خطاب بن عمر الانجاوی نے المعز الاشرف مولوی امیر کبیر سیفی جان بیگ امیر آخور کبیر کے کتب خانے کے لئے لکھا تھا۔ محلی بالذہب والالوان بھی ہے سطریں ۱۳، اوراق ۳۷۵۔

(۶۶) جلی قلم۔ احمد بن علی الفیومی نے اس کو ماہ رمضان ۹۰۸ھ (۱۵۰۲ء) ملک الاشرف قانصوہ الغوری کے حکم سے لکھا تھا محلی بالذہب والالوان ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۰۔

(۶۷) بخط ثلث اس کو احمد بن محمود الدمشقی نے ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں لکھا تھا۔ محلّی بالذّہب والالوان ہے۔ سلطان برقوق نے اس کو وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۴۷۔

(۶۸) جلی قلم ملک ظاہر ابوسعید خوش قدم کے کتب خانے کے لئے لکھا گیا۔ شروع میں ایک رسالہ آداب کتابت مصحف میں بھی ہے۔ محلی بالذہب والالوان ہے۔ جلد منقوش۔ سطریں ۱۲، اوراق ۳۱۹

(۶۹) جلی قلم۔ جس لفظ میں جلال وشان ہے وہ سونے سے لکھا ہوا ہے۔ محلی بالذہب۔ سلطان اشرف برسبائی نے ۸۳۶ھ (۱۴۳۳ء) میں اس کو وقف کیا تھا۔ (لکھا ہوا قبل کا ہے) سطریں ۱۱، اوراق ۳۰۲۔

Marfat.com

(۷۰) ۸۳۰ھ (۱۴۲۶ء) میں ابراہیم بن احمد بن عثمان الرقی نے جلی قلم لکھا تھا حاشیہ پر قرأت و تجوید ہے۔ اسمار قرأت اور اس کے رموز ہیں۔ محلےٰ بالذہب سطریں (۱) اوراق ۲۳۱ اس کو بھی سلطان اشرف بن النصر برسبائی نے ۸۴۱ھ (۱۴۳۷ء) میں وقف کیا تھا۔

(۷۱) خطاب بن عمر الانجاوی نے یاقوت مستعصمی کے طرز پر خط نسخ میں ۸۸۹ھ (۱۴۷۴ء) میں اس کو لکھا تھا اور ۱۹ محرم ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں ملک اشرف ابوالنصر قاتیبائی نے وقف کیا۔ محلےٰ بالذہب ہے سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۴۔

(۷۲) خط نسخ میں۔ جسکو ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں مملوک قائم بن جانم نے جو طبقہ زیامہ ملکی الاشرفی سے تھا، لکھا تھا۔ محلےٰ بالذہب، عبدالرحمٰن کتحذا نے اس کو وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۲۔

(۷۳) جس کو عبداللہ بن حجاج البرماوی نے ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) میں جلی قلم لکھا تھا۔ اس کو ابراہیم کتحذا کی لڑکی عائشہ نے وقف کیا تھا محلےٰ بالذہب۔ سطریں ۱۱، اوراق ۱۴۴۔

(۷۴) جس کو مملوک کرتبائی بن اقبائی شاگرد محمد بن علی السہیلی نے ۸۷۹ھ (۱۴۷۴ء) میں جلی قلم لکھا تھا۔ علم قرات میں ایک مقدمہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ سلطان قاتیبائی نے اپنی جامع مسجد کے لئے جو دمیاط کے اطراف میں واقع ہے اس کو ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) میں وقف کیا تھا محلےٰ بالذہب ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۵۸۔

(۷۵) یاقوت مستعصمی کے طرز پر خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ (ممکن ہے کہ یاقوت ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو) اول و آخر سے یہ نسخہ محروم ہے۔ محلےٰ بالذہب ہے۔ حاشیہ پر بخط سرخ تفسیری اشارات ہیں۔ سطریں ۹، اوراق ۳۸۹۔ (یاقوت کے لکھے ہوئے نسخوں کی تفصیل ۴۶ میں گذر چکی اگر اس کو ملا لیجئے تو سات نسخے ہوئے)

(۷۶) ماہ رمضان ۸۸۵ھ (۱۴۸۰ء) میں علی بن اخی قاسم بن رستم الرفاعی نے خط ثلث و خط نسخ میں لکھا تھا۔ مذہّب ہے۔ ملک الاشرف ابوالنصر قاتیبائی نے اس کو بھی وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۶۔

(۷۷) یہ دولت ممالک جراکسو برجیہ کے مصاحف میں سے ہے۔ سیدہ نفیسہ (وفات رمضان ۲۸۰ھ (۸۹۳ء)) بنت ابومحمد بن الحسن بن زید بن الحسن بن علی بن ابیطالب و زوجۂ مؤتمن اسحاق بن جعفر صادق نے اپنی مسجد میں جو مصر میں تھی یہ قرآن پاک رکھدیا تھا وہاں سے چوری ہوگیا تھا اور دس سال کے بعد پھر مسجد کے دروازے پر لٹکا ہوا پایا گیا۔ جب حسین بیگ حسنی کو اس کی خبر ملی تو اس نے اس قرآن پاک کو لیا اور مضبوط سرخ مرکو کے چمڑے سے مجلد کیا۔ جہاں جہاں خراب ہوگیا تھا اس کی ترمیم کی۔ اخیر میں تین ورق محمد بن وہبی نے ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں لکھکر چسپاں کئے، کلمات تغییر یہ بھی بین السطور لکھے حاشیہ پر قرأتیں بھی درج کیں۔ یہ نسخہ خط ثلث میں مطلا و مذہّب ہے۔ اسمار سور و عدد آیات سونے سے لکھے ہوئے ہیں اور سیاہ روشنائی سے مجدول ہے۔ اول میں آٹھ ورق مجدول و منقش و طلا کار ہیں۔ اس میں نصفین و اثلاث و ارباع و اسمار قراء سبعہ و ناسخ و منسوخ و ترتیب نزول آیات کو بھی بتایا ہے اور اسی طرح کی بعض اور مفید باتیں لکھی ہیں۔ (غالباً یہ سارے اضافے ناسخ و منسوخ و ترتیب نزول وغیرہ کے ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں یا اس سے کچھ پہلے محمد بن وہبی نے کئے ہوں گے۔ سطریں ۱۱ اوراق ۳۸۲۔

Marfat.com

مصاحف دولتِ عثمانیہ

(۷۸) اس نسخے کو محمد بن احمد حنبلی تبریزی نے ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں خط نسخ میں لکھا۔ ایک سطر طلائی ایک سطر سیاہ روشنائی سے۔ مطلا و مرصع اس کو ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ء) میں سلطان محمد خاں کی والدہ صفیہ نے وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۰، اوراق ۳۵۰۔

(۷۹) ۱۲۸۲ھ (۱۸۸۲ء) میں ابراہیم خلیل معروف شبکشی نے خط ثلث میں لکھا۔ مذہب و مرصع ہے۔ ۱۲۸۲ھ ہی میں حاجی عنبر آغا آغائی بریخی قادن آفندی نے مصر میں وقف کیا۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۴۔

(۸۰) اس کو قطب الدین کاتب نے خط نسخ میں لکھا۔ اس میں چار تفسیریں بھی ہیں۔ دو حاشیہ پر انوار التنزیل بیضاوی اور جواہر التفسیر للمولی حسین الکاشفی۔ اور جلالین اور ایک تفسیر فارسی صلب میں ہے۔ منقش و مذہب ہے۔ سطریں ۹، اوراق ۷۷۷۔

(۸۱) محمد روح اللہ بن حافظ محمد لاہوری نے اس کو ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ء) میں لکھا تھا بخط نسخ تیس ورق میں تیس پارے، ہر ورق میں ایک پارہ۔ یہ بھی بہت محلے و مذہب و ملون ہے۔ سطریں ۴۱ ہیں۔ ہر سطر کے اول کا الف سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ یہ التزام کیا ہے کہ ہر سطر الف ہی سے شروع ہو۔

(۸۲) کاتب مذکور ہی نے خط نسخ میں یہ نسخہ بھی اسی پہلے التزام کے ساتھ تیس ورق میں لکھا ہے۔ ہر ورق میں ایک پارہ بالکل اسی پہلے نسخے کی طرح لکھا ہے اس لئے اس کی سطریں بھی ۴۱ ہی ہیں۔

(۸۳) سلیمان کاتب نے معمولی خط میں ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں لکھا ہے محلے بالذہب ہے۔ حاجی سرور آغا تابع والدہ مرحوم حسین بیگ نے اس کو ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں وقف کیا۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۶۳۔

(۸۴) سید حافظ عثمان بن رشدی بن خلیل جو محمد واسم کے شاگرد تھے انھوں نے اس کو بخط نسخ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں لکھا تھا محلے بالذہب والالوان۔ سطریں ۱۵، اوراق ۲۰۲۔

(۸۵) بہاء الدین محمد بن الشیخ ابو الفضل اللاہجانی نے بخط نسخ ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) میں لکھا۔ شروع میں ایک فارسی رسالہ ہے۔ بین السطور بخط سرخ بعض کلمات کی تفسیریں ہیں۔ حاشیہ پر تفسیر طبری ہے۔ ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) میں یعقوب آفندی بن عبداللہ وزیر محمد علی پاشا والی مصر کے محاز سوم، خزانۂ مصر نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۲، اوراق ۳۰۴۔

(۸۶) ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں سید حافظ احمد معروف بہ شاملی زادہ کاتب نے اس کو بخط نسخ لکھا اور ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں الہامی پاشا کی والدہ نے اس کو وقف کیا۔ دائروں سے مرصع و مزین ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۷۔

(۸۷) حافظ اسماعیل حقی شاگرد سید محمد الحلمی نے ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں اس کو بخط نسخ لکھا۔ اس کو بھی الہامی پاشا کی والدہ مرحومہ نے ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں وقف کیا۔ یہ بھی مرصع و مزین ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۷۔

(۸۸) حاجی حافظ برہان الدین المعروف بعمر حافظ زادہ کاتب نے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں اس کو بخط نسخ لکھا۔ اس کو بھی الہامی پاشا

کی والدہ نے وقف کیا۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۴۔

(۸۹) سید محمد الحمدی شاگرد ابی بکر الوصفی نے ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۸ء) میں بخط نسخ لکھا۔ سلطان عبد العزیز خاں کی والدہ نے اس کو وقف کیا ہے چھوٹے دائروں سے مرصع و مزین ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۵۔

(۹۰) احمد خلوصی بن حاجی خلیل شاگرد ابراہیم ادہمی الحصاری نے بخط نسخ ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) میں لکھا۔ ولی پاشا کی دختر عائشہ ہانم نے وقف کیا۔ یہ بھی ماسبق کی طرح مرصع ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۴۔

(۹۱) معمولی خط۔ ہر سطر کا اول و آخر سرخ۔ حاشیہ پر بعض قرائتیں۔ ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں شیخ عبد الرحمٰن انصاری کی لڑکی منے اس کو وقف کیا تھا۔ لکھا ہوا بہت پہلے کا ہے۔ سطریں ۱۷، اوراق ۱۴۷۔

(۹۲) عبد الکریم بن احمد طلموسی نے معمولی خط میں ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۶ء) میں لکھا۔ بین السطور بخط سرخ بعض تفسیریں ہیں۔ محمد آغا بیگ شہری نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۷، اوراق ۱۴۷۔

(۹۳) حافظ سلیمان جرولی نے ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) میں لکھا۔ ہر صفحہ میں تین سطریں بخط ثلث، بیچ کی سطریں سرخ۔ امید رضوان نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۷، اوراق ۳۳۰۔

(۹۴) اول و آخر سطریں ازرق رنگ۔ بیچ کی سطر مذہب بخط ثلث و نسخ مذہب تو طوں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) میں امیر اللوا ایوب بیگ دفتر دار مصر نے وقف کیا۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۷۔

(۹۵) سلیمان بن یسار نے بخط نسخ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں لکھا۔ خدیو مصر کی حرم چشم آفت خانم نے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں وقف کیا۔ مذہب ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۹۵۔

(۹۶) علی حلمی شاگرد حافظ اسمٰعیل نے بخط نسخ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں لکھا جس کو علی آفندی مرشد نے وقف کیا۔ منقش و مرصع ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۴۔

(۹۷) سعیدی بن اسمٰعیل حامدی نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں بخط نسخ لکھا۔ اسی سال اس کو حسن کامی پاشا کی حرم رفیعہ ہانم کے غلام شعبان آغا نے وقف کیا۔ مرصع ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۳۔

کتب خانہ مصطفیٰ پاشا میں دولتِ عثمانیہ کے مصاحفِ مکتوبہ

(۹۸) اسمٰعیل یساری زادہ شاگرد حسین آفندی حفاظت زادہ نے بخط نسخ ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں لکھا۔ مصطفیٰ عرف جہانگیر نے طلاکاری کی اور نقوش بنائے۔ ایک ورق میں حلیۂ نبوی بھی ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۰۔

(۹۹) سلیمان الوہبی القادری شاگرد ابراہیم شوقی خلیفہ الزاہدی نے ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں بخط نسخ لکھا۔ مطلا و مذہب و منقش اخیر میں دعائے ختم قرآن۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۲۴۔

Marfat.com

(۱۰۰) احمد المعروف بنائی ساکن غلطہ نے ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) میں بخط نسخ لکھا۔ مطلاو مذہب ہے سطریں ۱۵، اوراق ۳۷۲۔ اس کاتب نے اس نسخے سے پہلے ۸۲ مکمل قرآن لکھے۔ یہ نسخہ ۸۳ واں ہے۔

(۱۰۱) سید عبداللہ المعروف بالامام شاگرد حافظ عثمان نے ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) میں بخط نسخ لکھا۔ عبداللہ مصطفیٰ نے مرصع و منقوش کیا۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۴۴۔

(۱۰۲) احمد اللہ المعروف بابن الشیخ نے بخط نسخ لکھا۔ اخیر میں فارسی زبان میں دعائیں ہیں اور دعائے ختم قرآن عربی میں ہے۔ سطریں ۱۲، اوراق ۵۵۲

(۱۰۳) ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں ابن علاء الدین محمد بن محمد الحسینی نے حاجی مرزا محمد باقر زادہ کے حکم سے بخط نسخ لکھا۔ حاشیہ بین السطور میں فارسی ترجمہ ہے۔ اخیر میں دعائے ختم قرآن ہے۔ مکمل مطلاّ و منقش ہے۔ سطریں ۱۲، اوراق ۳۷۱۔

(۱۰۴) سورۂ فتح و فاتحہ الکتاب شاہ محمد نیشاپوری نے بخط نستعلیق ۹۶۹ھ (۱۵۵۹ء) میں لکھا۔ منقش و مطلا مذہب ہے۔ سطریں ۷، اوراق ۹، مجلد۔

(۱۰۵) ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) میں احمد قمر حصاری شاگرد سید اسداللہ الکرمانی نے صرف سورۂ انعام کو خط ثلث و نسخ میں لکھا۔ نہایت مطلا و مذہب و مزین ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۱۲۔

(۱۰۶) یاقوت مستعصمی نے بخط نسخ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) لکھا، باین التزام کہ ہر صفحے کی آخری آیت اور پہلی آیت کو مطلا و مذہب و مزین ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۱۲۔ (یاقوت کے ہاتھ کے نسخوں کو نمبر ۴۶ میں دیکھیے)

(۱۰۷) سورۂ فاتحہ وانعام و کہف و سبا و فاطر آخری دو آیتوں کے سوا بخطِ نسخ یاقوت مستعصمی نے لکھا ہے۔ منقش و مذہب ہے۔ (یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کے نسخے ع۱ سے ع۱۱ تک ع۴۶ سے پہلے گذر چکے تھے یہ دو نسخے اور بھی ہیں جن میں ع۱ نامکمل ہے اور ع۵ زر اشتبہ کر اس حساب سے نو یا دس نسخے ہوئے۔)

(۱۰۸) بدست علی بن سلطان محمد القاری الہروی المعروف بملا علی القاری۔ مکتوبہ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) بخط نسخ خوشخط منقش و مذہب آخر میں دعائے ختم قرآن۔ سطریں ۱۵، اوراق ۴۱۲ - ملا علی قاریؒ متوفی ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) تھے۔

(۱۰۹) پارۂ عم کا بھی ربع عبداللہ بن محمد بن محمود ہمدانی نے ملک ناصر کے حکم سے ۷۱۳ھ (۱۳۱۳ء) میں بخط نسخ خوشخط لکھا۔ مرصع و مطلا و مذہب و منقش ہے۔ ۷۲۶ھ (۱۳۲۵ء) میں امیر سیف الدین بکتمر بن عبداللہ ساقی نے اسے وقف کیا۔ یہ ربع پارہ بھی دولت مالکِ بحریہ کا ایک بیش بہا جوہر ہے۔ سطریں ۵، اوراق ۳۶۔

(۱۱۰) ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں احمد اصفہانی نے بخط ثلث ملک ظاہر ابو سعید کے مدرسہ میں پارہائے ۳، ۵، ۸، ۹، ۱۱، ۲۸، ۲۹ (سات پارے) لکھے تھے۔ مذہب ہے سطریں ۱۱، اوراق علی الترتیب ۱۷، ۱۸، ۱۷، ۱۷، ۱۶، ۱۷، ۱۸ ہیں۔

ب

Marfat.com

خدیو مصر کے کتب خانے کے مصاحف کی مجمل فہرست

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
۱	علی محمد بن مقلہ	سنہ ۳۰۸ھ / ۹۲۰ء	نسخ
۲	مسعود بن محمد الکاتب الاصفہانی	سنہ ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء	″
۳	عبدالرحمٰن بن محمد بن ابی الفتح	سنہ ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء	″
۴	مسعود بن محمد بن مسعود بن الخطاط الاصفہانی	سنہ ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء	″
۵	یاقوت مستعصمی	سنہ ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء	″
۶	″	×	″
۷	احمد بن محمد بن کمال الانصاری (قاہرہ)	سنہ ۷۳۴ھ / ۱۳۳۳ء	″
۸	ابن خلیل بن محمد بن عبدالرحمٰن الحنفی	سنہ ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء	″
۹	علی بن محمد المکتب الاشرفی	سنہ ۷۷۴ھ / ۱۳۷۲ء	″
۱۰	محمد المکتب الشہابی	سنہ ۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء	″
۱۱	العبد الشافعی	سنہ ۷۴۰ھ / ۱۳۳۹ء	″
۱۲	حسن بن القاسم الجعفری	سنہ ۷۲۲ھ / ۱۳۲۲	″
۱۳	موسیٰ بن محمد بن الحسن التنوخی المالکی الاشرفی (قاہرہ)	سنہ ۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء	″
۱۴	مبارک شاہ	×	″
۱۵	عبدالرحمٰن بن صائغ	سنہ ۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء	″
۱۶	″	×	″
۱۷	″	×	″
۱۸	احمد اصفہانی	سنہ ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء	″
۱۹	موسیٰ بن اسمٰعیل الکتانی الحنفی المعروف بالجیبنی	سنہ ۸۳۰ھ / ۱۴۲۷ء	″
۲۰	جانم سیفی جانی بیگ	ابوالنصر ملک اشرف کا زمانہ	″
۲۱	سعد الحافظ السرائی	سنہ ۸۰۷ھ / ۱۴۵۵ء	نسخ
۲۲	ابراہیم بن احمد بن عثمان الرقی	سنہ ۸۳۰ھ	″
۲۳	خطاب بن عمر الدنجاوی	سنہ ۸۸۹ھ / ۱۴۸۴ء	″
۲۴	احمد بن علی القیومی	سنہ ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ء	″
۲۵	عبداللہ بن حجاج البرماوی	سنہ ۸۴۳ھ / ۱۴۳۹ء	″
۲۶	ملوک کرتبائی بل اقبائی تلمیذ محمد بن علی السہیلی	سنہ ۸۷۹ھ / ۱۴۷۴ء	″
۲۷	علی بن اخی قاسم بن سہم الرفاعی	سنہ ۸۸۵ھ / ۱۴۸۰ء	″
۲۸	احمد بن جمال الدین الحافظ الاصفہانی	سنہ ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء	″
۲۹	ملوک قانم بن جانم	سنہ ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء	″
۳۰	عبداللہ بن نصر اللہ	سنہ ۸۴۰ھ / ۱۴۳۶ء	″
۳۱	محمد بن احمد الخلیلی التبریزی	سنہ ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء	″
۳۲	قطب الدین	×	″
۳۳	محمد روح اللہ بن حافظ محمد حسین لاہوری	سنہ ۱۱۰۷ھ / ۱۶۹۵ء	″
۳۴	ایضاً	×	″
۳۵	بہاء الدین محمد بن الشیخ ابی الفضل اللاہجانی	سنہ ۱۱۹۷ھ / ۱۶۹۵	″
۳۶	حبیب اللہ الداعی از تلامیذ حسن	سنہ ۱۱۸۵ھ	″
۳۷	ایضاً	سنہ ۱۱۸۸ھ	″
۳۸	احمد العطائی تلمیذ اسمٰعیل دہبی آفندی	″	″
۳۹	عبدالقادر بن عیسیٰ	سنہ ۱۱۰۴ھ / ۱۶۹۲	″
۴۰	محمد سعید المعروف بصری تلمیذ الشکری	سنہ ۱۱۸۶ھ	″
۴۱	مصطفیٰ بروسی تلمیذ محمد نوری	″	″
۴۲	عبدالرحمٰن السعید الیاقوتی	″	″

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت
۴۳	احمد الشکری تلمیذ محمد نوری	سنہ ۱۱۸۸ھ	نسخ
۴۴	اسمعیل الظہوری	〃	〃
۴۵	صالح النجیب	〃	〃
۴۶	احمد ابو المعز الاحدی الشافعی	سنہ ۱۱۵۸ھ	〃
۴۷	محمد تمام	×	〃
۴۸	حاجی اسمعیل بن ابراہیم الحسطوتی	سنہ ۱۰۶۲ھ	〃
۴۹	غیاث الدین محمد بن احمد خلیل التبریزی	سنہ ۹۷۷ھ	〃
۵۰	ملا علی قاری محدث	سنہ ۱۰۰۰ھ / ۱۵۵۱ء	〃
۵۱	اسمعیل بیاری زادہ تلمیذ حسین آفندی معروف بخفاف زادہ	سنہ ۱۱۶۶ھ	〃
۵۲	حافظ عثمان	سنہ ۱۰۳۸ھ	〃
۵۳	احمد المعروف بنائلی ساکن غلطہ	سنہ ۱۱۹۵ھ	〃
۵۴	عبداللہ المعروف بامام تلمیذ حافظ عثمانی	سنہ ۱۱۱۸ھ	〃
۵۵	احمد اللہ المعروف بابن الشیخ	×	〃
۵۶	ایضاً	〃	〃
۵۷	سید حافظ عثمان المعروف بنائش زادہ	سنہ ۱۱۷۳ھ	〃
۵۸	حافظ احمد	سنہ ۱۰۹۳ھ	〃
۵۹	علاؤ الدین محمد بن الحسینی	سنہ ۱۱۴۰ھ / ۱۷۲۷ء	〃
۶۰	سید مصطفیٰ ملقب بزہدی محمد آفندی بن حاجی مصطفیٰ	سنہ ۱۱۹۸ھ	〃
۶۱	حافظ یوسف کاتب لسرائی القاہرہ	سنہ ۱۱۹۸ھ	〃
۶۲	درویش علی	سنہ ۱۰۸۹ھ	〃
۶۳	احمد المقری الحصاری تلمیذ اسد اللہ الکریانی	سنہ ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷ء	〃
۶۴	علی بن اخی بن رستم الرفاعی	سنہ ۸۸۵ھ / ۱۴۹۷ء	ثلث

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت
۶۵	علی بن احمد بن امیر علی بن لاجینی البہائی	سنہ ۹۰۳ھ / ۱۴۹۷ء	ثلث
۶۶	محمد علی الامام	×	〃
۶۷	احمد الاصفہانی	سنہ ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء	〃
۶۸	عبداللہ بن نصر اللہ	سنہ ۸۴۰ھ / ۱۴۳۱ء	〃
۶۹	یحیٰی بن الحسن بن احمد القاضی العوشی العراقی	سنہ ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء	〃
۷۰	عبداللہ بن محمود بن محمود الہمدانی	سنہ ۷۱۳ھ / ۱۳۱۳ء	〃
۷۱	احمد بن محمود الدمشقی	سنہ ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء	〃
۷۲	احمد المقری الحصاری تلمیذ اسد اللہ الکریانی	سنہ ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷	〃
۷۳	محمود بن حسین بن علی التنجوانی	سنہ ۷۶۲ھ / ۱۳۶۰ء	〃
۷۴	وہبی	سنہ ۱۲۸۴ھ / ۱۴۹۰	〃
۷۵	خیرت آفندی	×	〃
۷۶	ابراہیم خلیل المعروف بہ شبکشی	سنہ ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء	〃
۷۷	محمد بن کزل الحبادی	×	نسخ
۷۸	محمد امین التبریزی المعروف بہ ابن عبد السمیع	سنہ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰	〃
۷۹	سید حافظ عثمان الرشدی بن خلیل تلمیذ محمد راسم	سنہ ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء	〃
۸۰	حافظ احمد المعروف بہ شاملی زادہ	سنہ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء	〃
۸۱	حافظ اسمعیل حقی تلمیذ محمد حلمی	سنہ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء	〃
۸۲	حافظ برہان الدین معروف بعمر حافظ زادہ	سنہ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء	〃
۸۳	سید محمد حمدی تلمیذ ابی بکر الوصفی	سنہ ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء	〃
۸۴	احمد خلوصی بن حاجی خلیل تلمیذ ابراہیم ادہمی حصاری	سنہ ۱۲۲۸ھ / ۱۸۱۳ء	〃
۸۵	عبداللہ الراسخ تلمیذ عبداللہ الصدقی	سنہ ۱۲۹۶ھ	〃
۸۶	سید سلیمان النطقی تلمیذ امام زادہ	سنہ ۱۲۱۵ھ	〃

Marfat.com

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت
۸۷	شیخ صالح	سنہ ۱۲۳۶ھ	نسخ
۸۸	سلیمان بیاری	سنہ ۱۲۸۵ھ	〃
۸۹	علی الحلمی تلمیذ حافظ اسمٰعیل	سنہ ۱۲۸۶ھ	〃
۹۰	محمد سعید بن اسمٰعیل الحامدی	سنہ ۱۲۸۴ھ	〃
۹۱	شیخ مصطفی القیسی تلمیذ حسن بن محمود الجوزی	سنہ ۱۲۳۲ھ	〃
۹۲	سید عبداللہ الزہدی	سنہ ۱۲۷۷ھ	〃
۹۳	سید صالح المعروف بجمشید	سنہ ۱۳۱۱ھ	〃
۹۴	سلیمان الوہبی القادری الاشرقی تلمیذ ابراہیم الشوقی	سنہ ۱۲۴۴ھ	〃
۹۵	محمد عطاء اللہ المعروف لعریزادہ	سنہ ۱۲۸۶ھ	نستعلیق
۹۶	شاہ محمود نیشاپوری	سنہ ۶۵۶ھ / ۱۵۵۷ء	〃
۹۷	محمد عمدی بکرتاہی المعروف بحافظ الکتب تلمیذ سید المعروف برا باد	سنہ ۱۲۴۶ھ	نسخ
۹۸	سید حافظ محمد راشد المعروف بہ تربت دار حضرت خالد بن زید ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ	سنہ ۱۲۶۵ھ	〃

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت
۹۹	سید عبداللہ	×	نسخ
۱۰۰	محمد امین المعروف لعزتی	سنہ ۱۳۰۰ھ	〃
۱۰۱	سید صالح صلاحی	سنہ ۱۲۰۳ھ	〃
۱۰۲	محمد بن عمر الطنبوحی الشافعی	سنہ ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۰ء	〃
۱۰۳	ابوالحسن بن ابی طاہر	سنہ ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۷ء	معمولی
۱۰۴	محمد ابوالخیر المقری بن صالح السواق	سنہ ۱۲۸۶ھ	〃
۱۰۵	عبدالکریم بن احمد الطلموسی	سنہ ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء	〃
۱۰۶	مصطفی بن محمد (قسطنطینیہ)	سنہ ۹۳۵ھ	〃
۱۰۷	محمد الاجہوری	سنہ ۱۲۷۱ھ	〃
۱۰۸	یونس بن محمد الاندلسی	سنہ ۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۲ء	مغربی
۱۰۹	محمد ادلانت	×	〃
۱۱۰	مبارک بن محمد کوری	×	〃
۱۱۱	امام جعفر صادقؑ (المتوفی سنہ ۱۴۸ھ / ۷۶۵ء) مکمل نسخہ	×	کوفی

٭

یہ ایک سو گیارہ[111] صرف خدیو مصر کے کتب خانے کے ہیں اور اس سے پہلے ایک سو دس مصاحف کی فہرست آپ پڑھ چکے۔ سب ملا کر دو سو اکیس[221] مصاحف ہوئے۔ ان میں سے خدیو مصر کے کتب خانہ میں صرف ایک ہی نسخہ قدیم ۱۱۱ بخط حضرت امام جعفر صادقؑ ہے، اور یہ مکمل نسخہ ہے بخط کوفی۔ اور پہلی فہرست کے ۱۶ میں بھی نصف اول یعنی پہلے پندرہ پارے پورا سورۂ کہف تک امام ممدوح کے دست مبارک کا لکھا ہوا نسخہ مذکور ہے۔ امام ممدوح کی وفات سنہ ۱۴۸ھ مطابق ۷۶۵ء میں ہوئی تھی۔ یقیناً یہ دونوں مصاحف جن کو ڈیڑھ مصحف کہنا غلط نہ ہوگا سنہ ۱۴۰ھ یا اس سے پہلے یا کچھ بعد کے لکھے ہوئے ہوں گے اور حفص بن سلیمان الاسدی ابوعمر البزار الکوفی جن کی طرف اس قرارت متواترہ کوان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے انھوں نے بقول امام بخاری سنہ ۱۸۰ھ اور سنہ ۱۹۰ھ کے درمیان وفات کی ہے ابن حجر سنہ ۱۸۰ھ سال وفات لکھکر یہ بھی لکھتے ہیں کہ کہا گیا ہے سنہ ۱۹۰ھ کے قریب انھوں نے وفات کی۔ تو اس قول اور امام بخاریؒ کی تحریر کے پیش نظر ان کی وفات سنہ ۱۸۵ھ میں سمجھ لیجئے تو حضرت امام جعفر صادقؒ کی وفات سے ۳۷ برس کے بعد ان کی وفات ہے اور حفص بن سلیمان کی عمر ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱ میں ساٹھ برس لکھتے ہیں تو یہ امام جعفر صادقؒ کی وفات کے وقت ۲۳ برس کے

Marfat.com

نوجوان تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ امام ممدوح نے ایک بیس برس کے نوجوان کی قرأت کا اتباع کیا ہو اور اپنے دست مبارک سے اس کی قرأت کے مطابق دو دو بار پورا قرآن لکھا ہو۔

ع۶ والا نسخہ جو نصف اول ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انھوں نے نصف اول ہی لکھا تھا بہت زیادہ ممکن ہے کہ نصف دوم بھی دوسری جلد میں لکھا ہو مگر وہ ضائع ہو گیا ہو۔

پھر ع۲ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا اور ع۲۲ بھی۔ اور ع۳ حضرت علی مرتضیٰؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا اور ع۵ بھی۔ اور ع۴ امام حسنؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا نسخہ ہے اور حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہم تینوں کی وفات حفص بن سلیمان کی ولادت سے پہلے ہے اسلئے کوئی دیوانہ بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان بزرگوں نے قرأت حفص کے مطابق قرآن لکھا تھا۔

یہی حال ع۱۴ و ع۱۵ و ع۱۶ و ع۱۷ و ع۱۸ و ع۱۹ و ع۲۰ چھ نسخوں کا ہے جو قدیم ترین نسخے ہیں، اور یقیناً صحابہؓ ہی کے دست مبارک کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ پہلے پانچ نسخوں کو ملا لیجئے تو گیارہ نسخے ایسے قدیم ہوئے جو حفص کی پیدائش سے برسوں قبل کے ہیں مگر نہ ان گیارہ نسخوں کے آپس میں کسی قسم کا اختلاف ہے نہ دوسرے بعد کے نسخوں سے ان میں سے کسی نسخے کو آپ ذرا بھی مختلف پائیں گے اور نہ یہ دو سو اکیس نسخے مندرجہ فہرست مذکور آپس میں مختلف ہیں۔ پھر اسی قرأت متواترہ کو حفص کی طرف منسوب کرنا صرف اس لئے ہے کہ اس قرأت کی اہمیت تواتر کو کم کر دیا جائے۔ اس کی پوری بحث انشاءاللہ اس کتاب کی کسی دوسری جلد میں بضمن بیان اختلاف قرأت آئیگی۔ یہاں صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ قرآن کے قدیم وجدید نسخے باہم ذرا بھی مختلف نہیں ہیں۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا فہرست مصاحف چونکہ شائع شدہ ہے اور ملک کے ایک وقیع رسالے میں بہت پہلے چھپ چکی ہے اور ایک معتبر بزرگ کے تفحص وجستجو کا نتیجہ ہے اس لئے میں نے اس کو اس کتاب میں شائع کر دینا مناسب سمجھا۔ اگر تھوڑی اور کوشش کی جائے تو اس سے زیادہ نسخہائے مصاحف کی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ خود میرے پاس چار نسخے نہایت قدیم لکھے ہوئے مطلا و مذہب تھے۔ دو نسخے بخط کوفی تھے۔ ایک کے ابتدائی چند اوراق غائب ہو گئے تھے جن کو میرے جد اعلیٰ حضرت مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ پھلواروی تاج العارفین (متوفی ۱۲۰۰ھ) کے والد ماجد حضرت شاہ ظہور اللہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنے دست خاص سے لکھ کر پورا کر دیا تھا۔ اور دوسرا نسخہ کرم خوردہ ہو گیا تھا مگر مکمل تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب میں بہ نیت ہجرت ترک وطن پر آمادہ ہوا تو اپنے کتب خانے کی منتخب کتابیں اپنے ساتھ لے آیا اور فاضل کتابیں بعض اعزہ میں تقسیم کر دیں۔ وہ دونوں مصاحف اور کتابوں کے ساتھ اخی الاعظم حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان قادری چشتی پھلواروی رحمۃ اللہ کی خانقاہ سلیمانیہ کے کتب خانے میں داخل کر دیئے۔ اور دو قدیم قلمی نسخے جو بخط نسخ ہیں وہ میرے پاس یہاں موجود ہیں۔ خانقاہ منیر (صوبہ بہار) میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا نسخہ بھی موجود ہے۔ اسی طرح پتہ لگایا جائے تو بہت سے گھرانوں میں قدیم مصاحف کے نسخے ملیں گے۔ مگر میری غرض فہرست مصاحف قدیمہ پیش کرنے کی نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ قدیم وجدید جتنے نسخے بھی قرآن مجید کے جہاں کہیں بھی دنیا میں ہیں سب کے سب اسی ایک قرأت متواترہ ثابتہ صحیحہ کے مطابق لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں باہم کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں۔

Marfat.com

الحمدللہ کہ قرآن مبین کا ہر دعویٰ صحیح ثابت ہوا

مذکورہ بالا تصریحات سے قرآن مبین کے دونوں دعوے کہ ۱؎ ذٰلک الکتٰب لاریب فیہ۔ اور ۲؎ لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولامن خلفہ پوری طرح صحیح ثابت ہوگئے۔ اور ایک ضمنی دعویٰ عدم اختلاف کا بھی ایک حد تک صحیح ثابت ہوگیا یعنی اس اعتبار سے کہ اس کے نسخوں میں باہم کوئی اختلاف نہیں اور اختلاف قرارت کا شاخسانہ جو بلا وجہ عجم نے کوفہ میں بیٹھ کر قائم کر رکھا تھا، اور اس کو اس قدر شہرت دی کہ ایک ہزار برس سے تقریباً تمام مسلمانوں کے ایمانیات میں داخل ہو رہا ہے۔ قرآن پاک اور اس کے قدیم وجدید سارے نسخے ان اختلافات کی آلائشوں سے بالکل پاک ہیں اس کی مکمل بحث تو اختلافات قرارت والی جلد میں آئیگی مگر یہاں بھی اس پر روشنی ایک حد تک پڑ گئی۔ فالحمدللہ علی توفیقہ تائیدہ۔

قرآن مجید کے متعلق اللہ تعالیٰ کے وعدے

ایک وعدہ تو ایسا ہے جو تین وعدوں پر مشتمل ہے یعنی فرمایا گیا ان علینا جمعہ وقرآنہ۔ اس میں دو وعدے ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ اس کتاب کو جمع کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ اس کے بعد پھر تیسرا وعدہ فرمایا گیا کہ ثم ان علینا بیانہ پھر اس کو بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔

اب دیکھیے کہ یہ تینوں وعدے اللہ تعالیٰ نے کہاں تک پورے کئے۔ یہ ایک مرتبہ جو تین اہم کاموں کا یکجائی وعدہ فرمایا گیا تو اب ان میں کی ہر بات کو الگ الگ دیکھیے۔

۱؎ جمع قرآن

اس کی مکمل بحث تنقید احادیث جمع قرآن والی کتاب میں میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں اس پوری بحث کا اعادہ بے فائدہ ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ اس کتاب کی بھی کسی جلد میں انشاء اللہ تعالیٰ پوری تفصیل وتصریح کے ساتھ یہ بحث آئیگی مگر ان تینوں یکجائی وعدوں کی ترتیب پر نگاہ غور ڈالنے کی ضرورت ہے۔ پہلے پوری کتاب کو جمع کرا دینے کا وعدہ فرمایا اس کے بعد اس کے پڑھوا دینے کا پھر اس کے بیان کرا دینے کا وعدہ فرمایا۔

ظاہر ہے کہ جب تک پوری کتاب مجتمع نہ ہو جاتے اس کے الفاظ وکلمات مطابق وحی اعراب وسکون نقاط سے منضبط نہ ہوں، اس کی آیتیں اپنے جملہ الفاظ وکلمات کی مطابق وحی ترتیب کی جامع نہ ہوں اور اس کی سورتیں اس کی ساری نازل شدہ آیات پر مطابق وحی حاوی نہ ہوں اور پھر جب تک اس کی ساری سورتیں منشائے الٰہی کے مطابق یکے بعد دیگرے مرتب نہ ہوں اس وقت تک "جمع" کے لفظ کا اطلاق ہی اس کتاب پر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ مطابق وحی الٰہی اس کی قرارت وتلاوت ممکن ہے اور جب تک منشائے الٰہی کے مطابق اس کی قرارت وتلاوت نہ ہو تو اس کے معنی ومفہوم کا بیان کس طرح منشائے الٰہی کے مطابق ممکن ہو سکتا ہے؟

اسلئے یہ ماننا پڑیگا کہ جیسے جیسے آیتیں اور سورتیں اترتی گئیں منشائے الٰہی کے مطابق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو جمع کرتے اور صحابہ سے جمع کرانے رہے اور جمع کرانے کے بعد اس کو پڑھنے پڑھانے رہے اور پھر صحابہؓ کے سامنے اس کو بیان فرمانے رہے۔ جیسے جیسے باقی حصے آیتوں یا سورتوں کی شکل میں اترنے گئے جمع ہوتے گئے، پڑھے جانے رہے اور بیان کئے جانے رہے۔ یہاں تک کہ آخری سورہ اور

Marfat.com

آخری آیت اتر گئی اور قرآن مکمل ہوگیا تو پھر پورا قرآن جمع بھی ہوگیا اور پھر پورے قرآن کی قرأت بھی ہونے لگی اور پورے قرآن کا بیان بھی ہونے لگا

اس لئے ایسا سمجھنا کہ جمع قرآن کا کام تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہ ہوسکے، آپ کی وفات کے بعد عہد صدیقی میں کسی حد تک نامکمل سا رہ جائے اور اس کی تکمیل حضرت عثمانؓ میں ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مجتمع آیات و سورہ کی قرأت و بیان زندگی بھر کرتے رہے۔ قرآن و رسولؐ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سخت ترین گستاخی ہے اور درحقیقت ان علینا جمعہ وقرآنہ کے وعدۂ صادقہ کی تکذیب ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدوں کے مطابق پہلے آیتوں کو جمع کرایا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھوا دیا پھر صحابہؓ سے اسی جمع کے مطابق پڑھوا دیا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معانی و مفاہیم کو بیان کرا دیا۔

مفسرین کا ایمان چونکہ بخاری کی جمع قرآن والی روایت پر ہے اور ان کے عقیدے کے مطابق قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عہد صدیقی میں جمع ہوا اور عہد عثمانی میں صحیح طور سے یا پوری طرح شائع ہوا اسلئے یہاں ان علینا جمعہ سے وہ مراد لیتے ہیں جمعہ فی صدرہ صلے اللہ علیہ وسلم یعنی اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا تھا صرف اس بات کا کہ ہم اس قرآن کو تمہارے سینے میں جمع کر دیں گے یعنی تم پورے قرآن کے حافظ ہوجاؤ گے، جیسا کہ امام رازی وغیرہ مفسرین لکھتے ہیں، حالانکہ قرآن ہی میں قرآن کے متعلق فی صحف مکرمۃ موجود ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن دونوں کے بارے میں ارشاد ہے رسول من اللہ یتلوا صحفا مطہرۃ اللہ کے رسول تلاوت کرتے ہیں پاک صحیفے کی۔ اسلئے اگر قرآن صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک ہی میں جمع کیا گیا تھا تو ان صحیفوں میں کیا تھا جن کی تلاوت آپ برابر فرماتے تھے اور جن صحیفوں کو مکرم صحیفے فرمایا گیا؟

اور قرآن صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو اترا نہیں تھا بلکہ لیکون للعلمین نذیرا سارے عالم کیلئے اترا تھا اور تمام مومنین کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملنا چاہئے۔ اگر وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک سینے میں جمع کر دیا گیا تو دوسرے مومنین بس اسی قدر اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے جتنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یاد رکھ سکیں گے۔ اہل علم صحابہؓ کے سینوں میں بھی پورا قرآن جمع ہوچکا تھا۔ بل ھو آیٰت بینٰت فی صدور الذین اوتوا العلم وما یجحد بایٰتنا الا الظلمون (بلکہ وہ کھلی ہوئی واضح آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں (حفظ کے ذریعے) جن کو علم دیا گیا ہے اور ہماری آیتوں سے ظالموں کے سوا کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ (عنکبوت ع۵) تو جب صحابہؓ بھی جیسے جیسے قرآن اترتا رہا، یاد ہوتا گیا یہانتک کہ قرآن پورا ہوا تو وہ بھی پورے قرآن کے حافظ ہوگئے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کیا رہی، اور اگر کوئی خصوصیت ملحوظ نہ سمجھی جائے تو پھر یہ ذمہ داری کا اعلان کیا؟ یہ وعدہ ذمہ داری تو صاف بتا رہا ہے کہ یہ جمع کا کام جو ذمہ لیا جا رہا ہے کوئی ایسا ہی اہم کام ہے جو خداوندانہ ذمہ داری کے بغیر صحیح طور سے انجام ہی نہیں پا سکتا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ منتشر آیات و سُوَر جو وقتاً فوقتاً تیئیس برس کی طویل مدت میں کچھ مکے میں اور کچھ مدینے میں اترتے گئے ان کو اسی ترتیب کے ساتھ جو اصل کتاب مکنون میں۔ جس کو لیکر جبرئیل امینؑ پہلی بار غار حرا میں آپ کے پاس آئے تھے اور آپ میں پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرکے اور چند مناسب وقت آیتیں پڑھا واپس لیگئے تھے جس کی تصریح میں نے اپنی کتاب تنقید احادیث جمع قرآن کے ص۸۸ میں ایک طویل حاشیہ میں کی ہے، خلاف ترتیب نزول جمع کرنا اور اس اصلی ترتیب کے مطابق جو کتاب مکنون میں ہے اور پھر ٹھیک اسی ترتیب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے پڑھوانا اور

Marfat.com

کرادینا بغیر تائید الٰہی کے ناممکن تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذمہ خود لے لیا، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی طرف سے پورا اطمینان رہے۔ غرض ان علینا جمعہ سے مراد صحیفوں ہی میں جمع کرادینا ہے اور اسکی دلیل اس کے بعد کا فقرہ وقرآنہ بھی ہے کہ صحیفوں میں جمع کرا کے ان کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہؓ سے پڑھوانا مقصود ہے، یعنی وہ صحیفے جن میں قرآن جمع ہوگا ایسے ہوں گے کہ ان کی نقل در نقل ہو کر ساری دنیا میں پڑھے جائیں گے اور اللہ ہی اس کو رسولؐ سے اور صحابہؓ سے اور پھر تمام مسلمانوں سے پڑھوا دیگا۔

قرارت قرآن ان علینا جمعہ وقرآنہ میں "قرآن" کا لفظ اپنے معنی مصدری میں یعنی قرارت واقراء آیا ہے، اسی لئے اس کے معنی پڑھنا اور پڑھوانا یا پڑھانا لیا جاتا ہے مگر کتاب دیکھکر پڑھنا، یا زبانی پڑھنا، دوسرے سے سُن سُن کر اس کو دہرانا سب کو قرآت کہتے ہیں لیکن قرارت کا تعلق لکھنے سے ضرور ہے، اسلئے کہ صرف بولنے کو قرارت نہیں کہتے قرارت یا تو کتاب کی یعنی کسی لکھی ہوئی عبارت کی اسکو دیکھکر ہوتی ہے چاہے باآواز بلند ہو یا آہستہ یا صرف جی میں یا فقط نظر سے۔ یا کوئی لکھی ہوئی چیز کسی کو زبانی یاد ہو اور وہ اسکو زبانی پڑھے۔ غایت سے غایت کبھی کسی ایسی چیز کے زبان سے ادا کرنے کو بھی کہتے ہیں جو کہ لکھی جائیگی یا لکھی جاتی ہو مگر ایسا استعمال بھی قلیل ہے البتہ دو مفعول کے ساتھ آئے اور مفعول اول پر علیٰ ہو تو کہدینے اور کسی بات کے پیش کردینے کے معنی میں آتا ہے جیسے زید یقرء علیک السلام۔ اقرا علیہ السلام اور یہی حال "تلاوت" کا ہے کہ "تلاوت" کتاب دیکھکر پڑھنے کو کہتے ہیں مگر تلیٰ علیہ کے معنی زبانی کسی کے سامنے بیان کرنے کے بھی آتے ہیں جیسے واتل علیھم نبأ الذی اٰتینٰہ اٰیٰتنا۔ غرض قرآت ہو یا تلاوت، جب دو مفعول کے ساتھ آئے اور پہلے مفعول پر علیٰ ہو تو زبانی پڑھنے یا زبانی بیان کرنے یا کہدینے کے معنی یا پیش کرنے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اسی لئے یتلوا علیھم اٰیٰتہ میں عام مفہوم ہے کتاب دیکھکر اور بغیر کتاب دیکھے زبانی دونوں مفہوم کو شامل ہے لیکن ایک ہی مفعول کے ساتھ ہو تو "تلاوت" کتاب دیکھ کر ہی پڑھنے کے معنی میں آئیگی، اور قرآت کتاب دیکھکر ہو یا لکھی ہوئی چیز کی زبانی ہو سب کیلئے ہے، اتنی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ان علینا جمعہ وقرآنہ میں "جمع" سے مراد صحیفوں میں اس کتاب اللہ کو جمع کرا دینا ہے اور قرآنہ سے انھیں صحیفوں کی قرارت مراد ہے چاہے صحیفے دیکھکر ہو چاہے یاد کر لینے کے بعد زبانی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں طرح تلاوت فرماتے تھے، بطور خود مصحف دیکھکر بھی تلاوت فرماتے تھے اور لوگوں کے سامنے تعلیمؐ تبلیغ کے وقت زبانی بھی پڑھتے تھے۔ جہاں آپکے زبانی پڑھنے کا ذکر ہے وہاں دو مفعول کے ساتھ "تلاوت" کا صیغہ لایا گیا ہے اور مفعول اول پر علیٰ آیا ہے جیسے یتلوا علیھم اٰیٰتہ۔ اور جہاں کتاب دیکھکر پڑھنے کا ذکر ہے وہاں ایک ہی مفعول آیا ہے بغیر کسی صلے کے۔ جیسے رسول من اللہ یتلوا صحفا مطھرۃ۔ اور بطور خود تنہا زبانی پڑھنے کو یا نماز میں پڑھنے کو قرارت کہتے ہیں۔ آپ تنہا زبانی بھی پڑھتے تھے اور پھر نمازوں میں تو برابر پڑھتے ہی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کی صلاحیت معانقۂ جبرئیلؑ کے بعد پیدا ہو گئی تھی اس کا ذکر ابھی ہم "جمع قرآن" کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں اور اپنی کتاب تنقید احادیث جمع قرآن کے ص۸۵ کا حوالہ بھی دے چکے ہیں۔ امام رازی نے بھی تفسیر کبیر جلد ہشتم میں بضمن تفسیر سورۂ بیّنہ (پارہ عم) رسول من اللہ یتلوا صحفا مطھرۃ کی تفسیر لکھتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ فان قلت کیف نُسِبَت تلاوۃ الصحف المطھرۃ الی الرسول مع انہ کان امیاً؟ قلنا، اذا تلی مثل المسطور فی تلک الصحف کان تالیاً ما فیھا وقد جاء فی کتاب منسوب الی جعفر الصادق انہ علیہ السلام کان یقرء من الکتاب وان کان لا یکتب. ولعل ھذا من معجزاتہ (ص۲۴۲) یعنی "اگر تم کہو کہ صحف مطہرہ کی تلاوت کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف کس طرح کی گئی باوجود اس کے کہ آپ امی تھے؟ تو ہم کہیں گے کہ جب آپ نے صحیفوں میں لکھی ہوئی چیز بالکل تحریر کے مطابق پڑھی تو گویا اس کی تلاوت ہی فرمائی۔ اور ایک کتاب جو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے اس میں یہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ لکھتے نہ تھے مگر کتاب سے پڑھتے تھے اور یہ غالباً آپ کے معجزات میں سے تھا۔"

امام رازی کی اس تحریر سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک تو یہ کہ تلاوت کتاب دیکھکر ہی پڑھنے کو کہتے ہیں اسی لئے عجمیوں کے پروپا گنڈہ سے جو امی کے غلط معنی عام طور سے مفسرین و محدثین میں مشہور ہیں اور یہ جو شہرت دی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تادم وفات بالکل ان پڑھ ہی رہے اسکے مطابق ان کو اسکی تاویل کرنا پڑی کہ یہاں جو ایک امی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ پاک صحیفے تلاوت فرماتے تھے اس سے مراد ہے کہ وہ صحیفوں میں لکھی ہوئی آیتوں کو بالکل تحریر کے مطابق زبانی پڑھتے تھے حالانکہ اگر یہ مراد ہوتی تو یتلوا آیات اللہ فرمایا جاتا، اصل تو آیات اللہ ہیں نہ کہ صحیفے صحیفوں میں جو پاکیزگی آئی ہے وہ تو آیات ہی کی وجہ سے کوئی ضرورت صحیفوں کے ذکر کی نہ تھی۔ یہاں صحیفوں کا ذکر صرف اسی لئے ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ آپ صحیفوں کو دیکھ کر ایک پڑھے ہوئے آدمی کی طرح پڑھتے تھے۔ اگر یہ معنی مراد نہیں ہیں تو یہاں صحیفوں کا ذکر بالکل بے سود ہے مگر عام شہرت کی وجہ سے امام رازی کو تاویل کرنا ہی پڑی۔ لیکن اس تاویل کی رکاکت خود انھیں محسوس ہوئی اور ایک سند جواز کو امام جعفر صادق کی کتاب کی مل گئی اسکو لکھ ہی دیا کہ اس کتاب میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا تو نہیں جانتے تھے مگر پڑھنا جانتے تھے اور یہ قول بالکل قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے کہ وماکنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون ہ اور تم اس کتاب کے نزول سے پہلے کوئی کتاب پڑھ نہیں سکتے تھے اور نہ تم لکھتے ہو۔ اگر تم پہلے سے لکھے پڑھے ہوتے تو باطل پرست لوگ اور بھی شک و شبہ میں پڑتے (عنکبوت ع۵ پ۲۱) اور امی کے لفظ کے صحیح معنی ہم اپنی کتاب تنقید احادیث جمع قرآن میں لکھ چکے ہیں دیکھئے ص۔ پھر یہاں لکھدیتے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں مسلمانوں کے علاوہ دو جماعتیں تھیں ایک تو اہل کتاب جن کے پاس کوئی ایسی کتاب تھی جس کو قرآن نے کتاب اللہ تسلیم کیا ہے یا کم سے کم وہ خود کوئی کتاب اپنے دینی استناد کیلئے رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جن کے پاس کوئی کتاب ہی نہیں ہے وہ محض مادر زاد دین پر ہیں جو کچھ ماں باپ سے بچپن کے زمانے سے سنتے چلے آرہے ہیں بس اسی کو وہ اپنا دین و مذہب سمجھتے ہیں۔ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے ومنھم امیون لا یعلمون الکتب الا امانی اور ان کفار میں سے کچھ لوگ امی ہیں جو کتاب وتاب نہیں جانتے بجز من گھڑت منصوبوں کے (سورہ بقرہ ع۹ پ۱) اور فرمایا گیا قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ااسلمتم جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے ان سے اور امیوں سے پوچھو کہ کیا تم لوگوں نے اسلام قبول کیا (آل عمران ع۲ پ۳) یہاں اہل کتاب کے بعد ان کے مقابلے میں امیوں کا ذکر کر کے اس کو صاف بتا دیا کہ امی وہی لوگ تھے جو اہل کتاب نہ تھے اور یہ اصطلاح خاص قرآن کی نہیں ہے بلکہ اسلام سے پہلے اہل کتاب مشرکین مکہ بلکہ سارے بنی اسماعیل کو امی ہی کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنے دین و مذہب کے لئے کسی کتاب کی سند نہیں پیش کر سکتے محض مادر زاد دین پر ہیں۔ چنانچہ قرآن ہی میں اہل کتاب کا قول نقل فرمایا گیا ہے کہ ذلک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل (اہل کتاب بنی اسماعیل کے ساتھ بدمعاملگی کیا کرتے تھے، ان کی امانتیں غصب کر جاتے تھے خیانت کرتے تھے۔ ایسا کیوں کرتے تھے اس کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ) یہ اسلئے کہ یہ لوگ کہتے تھے کہ ان امیوں کے بارے میں (اگر ہم ان کے ساتھ کچھ کریں تو) ہم پر کوئی الزام نہیں ہے (آل عمران ع۸ پ۳) مجھ کو اس پر اصرار نہیں ہے کہ امی کے معنی ان پڑھ کے نہیں ہیں، ہوں۔ مگر قرآن مجید میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا

Marfat.com

بنی اسماعیل کو امی یا امیین کہا گیا ہے اس سے مراد قرآنی اَن پڑھ نہیں ہے، بلکہ وہی اہلِ کتاب کا بالمقابل یعنی مادرزاد دین والی قوم یا اس قوم کا ایک فرد گویا غیر اہلِ کتاب کے معنی میں آیا ہے۔ اور میرا یہ دعوی مذکورہ بالا آیات اور اس قسم کی اور دوسری آیات وغیرہ سے پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے۔

یہ امّی کی بحث تو محض امام رازی کی عبارت کی وجہ سے سامنے آگئی اس کو اس موضوع بحث سے چنداں سروکار نہیں۔ اسی طرح تلاوت کی بحث بھی قراءت کے طفیل میں یہاں چھڑ گئی مجھ کو کہنا یہ تھا کہ جب "جمع" سے یہاں مراد صحیفوں میں قرآن کا جمع کرانا ہے تو یہاں پڑھنے سے بھی مراد صحیفے دیکھ کر ہی پڑھنا ہے کہ ایک اَن پڑھ سے کتاب کا پڑھوا دینا ضرور ایک ایسی اہم بات ہے جو اللہ تعالیٰ ہی کی ذمہ داری سے حاصل ہو سکتی ہے، ورنہ بغیر کتاب دیکھے صرف زبانی یاد کرکے پڑھنا تو کوئی ایسی اہم بات نہیں جس کی ذمہ داری کا اعلان قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جائے یہ کام تو ایسا ہے جسکو اسوقت کم عمر نابالغ صحابہؓ کر رہے تھے اور آج تک کرنے والے کر رہے ہیں۔

بیانِ قرآن

"بیان" کے معنی ہیں توضیح، کشف اور کسی بات کو اس طرح واضح طور پر کھول کے کہنا کہ سننے والا اسکے ہر پہلو کو پوری طرح سمجھ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہوا تو اس کے متعلق تین خدمتیں آپ کو تفویض ہوئیں ۱ تبلیغ حکم ہوا کہ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک۔ اے رسول! جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تم اس کو لوگوں تک پہنچا دو (مائدہ ۱۰) ۲ تعلیم۔ لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ۔ اللہ نے مومنین پر بڑا احسان کیا جو انہی میں سے ایک رسول ان کی طرف بھیجا کہ ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے رہیں اور ان کو (کفر و شرک و گمراہی کی ناپاکیوں سے) پاک کردیں اور انھیں کتاب اللہ اور حکمت کی تعلیم کریں۔ (آل عمران ۱۷) ۳ تبیین۔ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم اور ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو تمہاری طرف اسلئے اتارا ہے تاکہ لوگوں کی طرف جو کچھ اتارا گیا ہے اس کو تم لوگوں کیلئے کھول کر بیان کردو۔ (نحل ۶ ۱۲)

یہ تین خدمتیں بظاہر تین معلوم ہوتی ہیں کیونکہ تبلیغ عام ہے اسلئے کہ پہنچا دینے والا صرف پہنچا دینے کا ذمہ دار ہے۔ چاہے جس کے پاس اللہ کی کتاب پہنچائی گئی وہ اسکو سمجھ سکے یا نہ سمجھ سکے۔ اسی لیے بعض لوگوں نے ما علی الرسول الا البلٰغ رسول کے ذمے پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں (مائدہ ۱۳) دھوکا کھایا اور سمجھے کہ سمجھنا یا نہ سمجھنا امت کا کام ہے رسول اللہ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے۔ لوگ اسکو سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ حالانکہ یہ مطلب نہیں ہے۔ دوسری جگہ بلکہ تقریبًا دوسری تمام جگہوں میں البلٰغ المبین ہے یعنی وضاحت کے ساتھ سمجھاتے ہوئے آیاتِ الٰہی کو امت تک پہنچا دینا دیکھیے سورۂ نحل ۵ ع ۱۱ اور سورۂ مائدہ ۱۲ و نور ۷ و عنکبوت ۲ و یٰس ۲ و تغابن ۲ غرض صرف الفاظ کا پہنچا دینا بلاغ نہیں ہے بلکہ آیاتِ الٰہی کو اس طرح پہنچا دینا بلاغ ہے کہ جنکے پاس یہ آیتیں پہنچائی جائیں ان کو ان آیتوں کا پورا مفہوم بھی سمجھا دیا جائے کیونکہ اصل مقصد مفہوم کا پہنچانا ہے نہ کہ صرف الفاظ کا۔ اور یہ جو حصر کے ساتھ فرمایا گیا کہ رسول کے ذمے پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں، اس حصر کے معنی یہ ہیں کہ رسول کے ذمے صرف آیاتِ الٰہی کے الفاظ و معانی کو پہنچا دینا ہے اور معانی کا پہنچانا معانی کو سمجھا کر ہی ہو سکتا ہے اسلئے تعلیم کتاب بھی درحقیقت تبلیغ ہی کا ایک جزو ہے۔ تو رسول کے ذمے آیتیں پہنچا دینا اور ان کے معنی مفہوم سمجھا دینا ہے، لوگوں سے منوا دینا نہیں ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، رسول اس کے ذمہ دار نہیں۔ یہ مطلب ہے اس حصر کا جو الا البلٰغ اور الا البلاغ المبین میں ہے۔

Marfat.com

اتنی تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ تبلیغ و تعلیم و تبیین درحقیقت ایک ہی بات کی تین نوعیتیں ہیں۔ بغیر تبیین کے تعلیم ناقص ہے اور بغیر تعلیم کے تبلیغ نامکمل، اسلئے مکمل تبلیغ وہی ہے جو تعلیم و تبیین کے ساتھ ہو۔

تبیین کا ایک مقصد اور بھی اسی سورۂ نحل کے آٹھویں رکوع میں بیان فرمایا گیا ہے وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ وھدی ورحمۃ لقوم یومنون، اور ہم نے اس کتاب کو اسی لئے تم پر اتارا ہے کہ جو لوگ دینی باتوں میں اختلاف رکھتے ہیں تم اس کتاب کے ذریعے ان کے دینی اختلاف کا فیصلہ واضح طور سے ان کے سامنے بیان کردو اور یہ کتاب ایمان رکھنے والی قوم کے لئے وثیقۂ ہدایت اور وسیلۂ رحمت ثابت ہو۔ اس آیت سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کی جو تبیین بھی فرمائیں گے قولی ہو یا عملی وہ مختلف نہیں ہوسکتی کیونکہ آپ کی تبیین کتاب اللہ اختلاف مٹانے کیلئے تھی نہ کہ اختلاف پیدا کرنے کیلئے، اسلئے کسی ایک حکم کی تعمیل کے جو مختلف طریقے حدیثوں میں ملتے ہیں ان میں سے وہی ایک طریقہ اور وہی ایک حدیث صحیح ہے جو قرآن سے قریب تر ہو، اور باقی سب غلط۔ چاہے ان باقی کے راوی کیسے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں، اور وہ صحاح ستہ کی متفق علیہ ہی حدیثیں کیوں نہ ہوں۔ اور وہ ایک حدیث جو قرآن سے قریب تر ہے، اسکا راوی کیسا ہی مجروح کیوں نہ ہو، اور وہ صحاح ستہ سے باہر ہی کی حدیث کیوں نہ ہو۔ بلکہ شیعوں کی اصول کافی وغیرہ ہی کی حدیث کیوں نہ ہو۔ کیونکہ مقصود قرآن اور مطابقت قرآن ہے نہ کہ کوئی دوسری کتاب یا راوی۔ گوہر مقصود جہاں بھی ملے اسکو لے لینا چاہئے اور اپنی جیب میں اگر کنکر پتھر ہوں تو ان کو پھینک ہی دینا مقتضائے عقل و دیانت ہے۔ نہ یہ کہ انھیں کنکر پتھر کو موتی کہہ کہہ کر اپنے کو دھوکا دینا ہی مقتضائے دیانت سمجھا جائے۔ ع متاع نیک ہر دکاں کہ باشد۔

خیر یہ تو ایک مضمون ضروری و مفید تھا اسلئے استطراداً اس جگہ زبان قلم پر آگیا۔ اور خارج از موضوع ہوتے ہوئے بھی یہاں داخل کیا ہوگیا۔ میں عرض کر رہا تھا "بیان قرآن" کو گذشتہ تصریحات میں میں عرض کرچکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے قرآن سے متعلق تین خدمتیں تھیں۔ تبلیغ، تعلیم اور تبیین اور یہ بھی عرض کرچکا ہوں کہ تبیین کے بغیر تعلیم ناقص ہے اور تعلیم کے بغیر تبلیغ نامکمل تو اصل چیز تبیین ہی ٹھہری اور اسی لئے تبلیغ و تعلیم سے یہ زیادہ اہم اور زیادہ مشکل ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تبلیغ و تعلیم کے بعد بھی کسی کی تشفی نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوسکتا کہ تبیین کے بعد بھی اس کی تشفی نہ ہو جس کے سامنے جسکو مخاطب کرکے تبیین کی گئی۔ تبیین کے بعد بھی انکار وہی کریگا جو ہٹ دھرم ہو۔ سچا آدمی جو سچی بات کو مان لینے کا خوگر ہے وہ ہوسکتا ہے کہ صرف تبلیغ یا تعلیم کے بعد بھی کسی شک وشبہ میں رہ جائے۔ مگر تبیین کے بعد بھی اگر شک وشبہ اس کو باقی رہ گیا تو یقیناً تبیین کا قصور و نقص ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ کی طرف سے تبیین کتاب ہی کیلئے بھیجے گئے ان کی تبیین میں کبھی کسی قسم کا قصور و نقص نہیں ہوسکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین کو سن کر یا دیکھ کر بھی کسی کو اس آیت میں جسکی تبیین اس نے سنی یا دیکھی کسی قسم کا شبہ رہ جائے خصوصاً جس تبیین کیلئے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمالیا کہ ثم ان علینا بیانہ یعنی تم جب کبھی کسی کی تبیین کرنے لگوگے تو تمہاری تبیین کے وقت اس کتاب کی آیتوں کے مفہوم کو واضح کردینے کے ہم ذمہ دار ہیں۔ تبیین بغیر بیان کے نہیں ہوسکتی بیان کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی تو پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تبیین آسان بھی ہوگئی اور اسکی صحت بھی قطعی ہوگئی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر تبیین جو کسی آیت کے متعلق ہو بیان الٰہی کے ماتحت ہو اسلئے اس میں غلطی اور بھول چوک کا احتمال بھی نہیں ہوسکتا۔

Marfat.com

تبلیغ و تعلیم کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے نہیں لیا، اسلئے کہ یہ دونوں ہلکے کام تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور خود اپنی فراست نبویہ سے باحسن وجوہ تبلیغ و تعلیم کے فرائض انجام دے سکتے تھے مگر تبیین کا فرض انجام دینے میں تائید الٰہی کی ضرورت تھی اسلئے صرف تبیین کے موقع پر بیان کی ذمہ داری اللہ نے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطمئن کر دیا۔

علینا بیانہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رسول تو تبیین کرینگے اور اللہ تعالیٰ بیان فرمائیگا، انھیں معنی میں جس معنی میں اردو فارسی زبان والے "بیان" کا لفظ بولتے ہیں یا عربی میں بھی بولا جاتا ہے تبیین بھی رسول ہی کی زبان سے اور بیان بھی رسول ہی کی زبان سے، مگر تبیین کے وقت قوت بیانیہ عطا کرنا اور اس تبیین میں بیان کی کیفیت یعنی توضیح و کشف کی صفت پیدا کر دینا اور ان باتوں کو جو تبیین کے وقت بیان فرمائی جائیں سننے والوں کے دل میں اتار دینا، یہ اللہ کے کام ہیں اور وہ یہ باتیں ہیں جو تبیین کیوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک قلب مبارک و زبان مبارک سے اور پھر سننے والوں کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کر دی جاتی تھیں تو یوں سمجھئے کہ تبیین کا حاصل مصدر بیان ہے اصل فعل یعنی تبیین جب رسول اللہ کرتے تھے تو اسکا حاصل مصدر جو تبیین سے پیدا ہوتا تھا اسکو اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتا تھا۔

تو پہلا بیانِ قرآن تو وہ ہوا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین قرآن کے سلسلے میں بتائید الٰہی آپ کی زبانِ مبارک سے ہوتا رہا اسکے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہر اس سچے متقی مسلمان کے ساتھ پورا اترتا رہا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین قرآنی کو شمع ہدایت بنا کر فرقہ بندیوں اور اتباع نفس سے بالکل کنارہ کش ہو کر دیانت داری کے ساتھ تدبر فی القرآن کیا اور تبیین قرآن کا فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں انجام دینے لگا۔ اس دوسرے بیانِ قرآن کا سلسلہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے آج تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہیگا۔ ثنائی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

عروس معنی قرآنِ نقاب آنگہ براندازد   کہ خلوت خانۂ دل را مجرد سازی از غوغا

جب تدبر فی القرآن کرنیوالے کا دل فرقہ پرستی و اسلاف پرستی اور اتباع ہوا کے غوغا سے خالی ہو اور اسکے پاس تدبر فی القرآن کا سامان بھی ہو، یعنی وہ عربی زبان و اصول ادب سے کافی واقفیت رکھتا ہو اور پھر وہ اللہ پر اور قیامت کی بازپرس و ثواب و عذابِ آخرت پر ایمان بھی رکھتا ہو اس کے دل میں اللہ کے عذاب اور قیامت کے محاسبے کا سچا ڈر بھی واقعۃً موجود ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اسکے لئے ثم ان علینا بیانہ کا وعدہ پورا نہ ہو۔

جمع قرآن کا وعدہ قراءت و اقراء قرآن کا وعدہ اور پھر بیان قرآن کا وعدہ یہ تینوں وعدے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے مبارک زمانے میں آپ ہی کی ذات مبارک سے اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعے پورے کرا دیئے گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد سے برابر پورے ہوتے چلے آرہے ہیں، اور قیامت تک پورے ہوتے رہیں گے۔ یہ اللہ کے وعدے ہیں اور اللہ کے وعدے جھوٹے نہیں ہو سکتے۔

قرآن مجید کی ایک سو چودہ ۱۱۴ سورتوں میں سے ہر سورہ کی آیتیں ہر سورہ کے کلمات یعنی الفاظ ہر سورہ کے حروف ہر سورہ کے اعراب یعنی زبر، زیر، پیش، جزم اور نقطے تک گن لئے گئے جسکی تصریح و تفصیل پر متعدد کتابیں اہل توفیق نے لکھی ہیں۔ اسکی طویل بحث سے قطع نظر کر کے مختصر سی تفصیل ناظرین کے استفادے کے خیال سے یہاں لکھدیتا ہوں۔

سورتیں	۱۱۴	فتحے (زبر)	۳۵۲۴۳	مدات	۱۷۷۱	معانقے	۳۴
آیتیں	۶۶۶۶	ضمے (پیش)	۸۸۰۴	نقطے	۱۰۵۶۸۴	رکوع	۵۵۲
کلمات یعنی الفاظ	۸۶۴۳	کسری (زیر)	۳۹۵۸۲	سجدے	۱۴	سورتوں کے حساب سے	
حروف	۳۲۰۳۶۷۰	تشدیدات	۱۲۵۳	(متفق علیہ)		"	

Marfat.com

اجزار یعنی پاروں کی تقسیم بہت بعد کی ہے اور رکوعوں کی تقسیم قبل کی۔ اسلئے رکوعوں کا حساب سورتوں ہی کے اعتبار سے صحیح تھا مگر بعد کو لوگوں نے پاروں کے حساب سے بھی رکوعوں کی گنتی قائم کی تو پھر دونوں حسابوں میں فرق ہوگیا یعنی پاروں کے حساب سے ۵۵۷ رکوع ہوتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ کتنے پارے درمیان رکوع (بحساب سورہ) کے ختم ہوتے ہیں تو وہ رکوع باعتبار اپنے نصف اول کے تو سابق پارہ میں پڑتا ہے اور نصف آخر کے بعد والے پارے میں۔ تو اس رکوع کا نصف اول تو سابق پارے کا رکوع گنا گیا اور نصف آخر بعد والے کا رکوع۔ اسلئے سورہ کا وہ ایک رکوع پارے میں دو ہوگیا اور دو بار گنا گیا۔ اسی لئے سورتوں کے اعتبار سے جو تعداد رکوعوں کی ہے، اس سے ان رکوعوں کی تعداد بڑھ گئی جو اجزار یعنی پاروں کے حساب سے تعداد قائم کی گئی ہے۔

قرآن مجید کی سات منزلیں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے قائم فرمائی تھیں جو پہلے منزلیں نہیں کہی جاتی تھیں۔ عہد نبوی و عہد صحابہ میں ان کو سات احزاب کہتے تھے جسکے حساب یاد رکھنے کیلئے علمانے فمی بشوق کا لفظ بنالیا ہے یعنی فٓ سے سورہ فاتحہ جس سے پہلا حزب یعنی پہلی منزل شروع ہوتی ہے مٓ سے سورہ مائدہ جہاں سے دوسرا حزب یعنی دوسری منزل شروع ہوتی ہے۔ یٓ سے سورہ یونس بٓ سے سورہ بنی اسرائیل۔ شٓ سے سورہ شعراء۔ وٓ سے سورہ والصّٰفّٰت قٓ سے سورہ قاف۔ ان سات احزاب کا ذکر میں اپنی کتاب تنقید احادیث جمع قرآن کے صفحہ ۳۱ میں کرچکا ہوں۔

رسم خط قرآنی رسم خط کی حفاظت بھی تمام لکھنے والوں نے پوری طرح ملحوظ رکھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے پہل جس آیت کو جس کاتب وحی سے لکھوایا اور اس کاتب وحی نے جس طرح لکھا جب اس کی نقل کی گئی تو پھر نقل کرنیوالے نے بالکل اسی طرح لکھا جس طرح پہلے کاتب نے لکھا تھا۔ اس میں کسی قسم کا ردو بدل کسی نقل کرنے والے نے جائز نہ رکھا اور رسم خط کی حفاظت کا یہ سلسلہ عہد نبوی سے آجتک بالکل ایک طرح سے چلا آرہا ہے اسی لئے آپ جتنے مصاحف قدیمہ و جدیدہ کو دیکھیں گے یہانتک کہ جب سے طباعت کی صنعت نکلی ہے اور قرآن مجید کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے اسوقت سے جس مطبوعہ نسخہ کو بھی دیکھئے چاہے وہ مصر کا چھپا ہوا ہو یا عراق کا۔ ایران کا مطبوعہ ہو یا ہندوستان کا کسی دو نسخوں میں رسم خط کا کوئی اختلاف نہ پاسکیں گے۔ مثلاً "صلوٰۃ" کا لفظ پورے قرآن میں ٦٧ جگہ ہے لیکن ۸ جگہوں کے سوا باقی ۵۹ جگہوں میں واو پر کھڑا زبر دیا جاتا ہے اور صرف آٹھ جگہوں میں صاد کے بعد لام الف لکھتے ہیں۔ جس قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید قلمی یا مطبوعہ نسخے کو اٹھا کر دیکھئے آپ آٹھ جگہوں میں صلاۃ لام الف سے لکھا ہوا پائیں گے اور باقی ہر جگہ صلوٰۃ واو پر کھڑے زبر کے ساتھ دیکھیں گے۔ وہ آٹھ جگہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) سورہ انعام رکوع ۱۱ وھذا کتٰب انزلنٰہ مبارک مصدق الذی بین یدیہ ولتنذر ام القرٰی ومن حولھا والذین یؤمنون بالاٰخرۃ یؤمنون بہ وھم علی صلاتھم یحافظون۔ یہ کتاب ہے جسکو ہم نے اتارا ہے برکت والی ہے اور جو کتابیں اسکے آگے (اتر چکی) ہیں انکی تصدیق کرنیوالی تاکہ تم مکہ والوں کو اور مکے کے اردگرد رہنے والوں کو (نتیجۂ نافرمانی سے) ڈرا دو۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ (ضرور) اس پر ایمان لے آئیں گے اور وہ اپنی نماز کی محافظت کرتے رہتے ہیں۔[1]

(۲) سورۂ انعام کا آخری رکوع ۲۰ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین۔ کہدو کہ میری نماز میری قربانی میری حیات اور میری موت

---

[1] یہ اتنی بات ہے کہ جو شخص آخرت پر یعنی مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی اور قیامت کی سزا و جزا پر یقین نہیں رکھتا قرآن پر کیوں ایمان لانے لگا؟ بلکہ وہ خدا ہی کو کب مانیگا کہ خدا کی کتاب اور خدا کے رسول پر ایمان لائیگا مگر ایمان و یقین تو ایک قلبی چیز اور پوشیدہ بات ہے۔ زبان سے ایک منکر بھی کہہ سکتا ہے کہ مجھ کو قیامت کی باز پرس اور سزا و جزا پر یقین کامل ہے اس لئے آخرت کا ایک عملی ثبوت بھی بتا دیا گیا اور وہ لوگ اپنی نماز کی محافظت کرتے رہتے ہیں یعنی اگر ان کو دیکھو کہ وہ نماز کے پابند ہیں تو سمجھ لو کہ بیشک وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اگر نماز بالکل نہیں پڑھتے تو سمجھ لو کہ آخرت پر ایمان ہی نہیں ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر جس نے نماز قصداً ترک کردی تو سمجھ لو اس نے کفر اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو کفر و شرک سے محفوظ رکھے۔ آمین ۱۲ منہ غفرلہ

Marfat.com

سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔ (ففدیۃ من صیام او صدقۃ او نسک) میں نسک کے معنی بالاتفاق ذبیحہ ہے جو اردو محاورے میں قربانی کہا جاتا ہے اسلئے میں نے یہاں نسک کا ترجمہ قربانی لکھا بعض لوگوں نے یہاں نسک کا ترجمہ حج لکھا ہے چونکہ ارکان حج کو مناسک حج کہتے ہیں بعض لوگ صرف "عبادت" ترجمہ لکھتے ہیں کیونکہ عابد اور عبادت گذار کو ناسک کہتے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ نسک[1] کا لفظ کہیں بھی حج یا عام عبادت کے معنی میں نظر نہیں آتا جہاں بھی ملتا ہے "ذبیحہ" ہی کے معنی میں ہے اسلئے میں نے قربانی ترجمہ کیا۔ نسک و مناسک و ناسک سے میں اسوقت بحث نہیں کرتا اور نہ ان کے استعمال پر قیاس کرکے نسک کے مستعمل معنی کو چھوڑ کر کوئی دوسرے معنی لینا صحیح سمجھتا۔ صلاۃ کا تعلق زندگی کے ایک کام سے ہے اور ذبیحہ کا تعلق ایک جانور کو اللہ کے نام پر اللہ کے حکم کے مطابق موت دینے سے ہے۔ اسلئے اس کے بعد محیای و مماتی کا ذکر گویا لف و نشر مرتب کی شان اور ادبی لطافت دکھا رہا ہے۔ غرض معنوی و لفظی دونوں اعتبار سے یہاں نسک کا ترجمہ قربانی ہی صحیح ہے۔

(۳) سورۂ انفال رکوع ۴۔ وما کان صلاتہم عند البیت الا مکاء و تصدیۃ۔ اور نہ رہی ان (مشرکین مکہ) کی نماز سوا خانہ کعبہ کے پاس سیٹی بجانے اور تالیاں پیٹنے کے۔

(۴) سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۱۲۔ ولا تجہر بصلاتک ولا تخافت بہا وابتغ بین ذلک سبیلا۔ تم اپنی نماز کو نہ بلند آواز سے پڑھو نہ اس کو آہستہ آواز سے پڑھو ان دونوں کے درمیان ایک راہ اختیار کر لو (یعنی اوسط درجے سے پڑھنے کی نکال لو)[2]

(۵) سورۂ مومنون رکوع اول آیت دوم الذین ہم فی صلاتہم خاشعون۔ ان مومنین نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع رکھتے ہیں۔

(۶) سورۂ نور رکوع ۶۔ کل قد علم صلاتہ و تسبیحہ (جو کچھ آسمان و زمین میں ہے یہانتک کہ پرندے بھی جو صف باندھ کر اڑتے ہیں) سب اپنی نماز اور اپنی تسبیح جانتے ہیں، (اس کی مفصل بحث میری فارسی مثنوی معاش و معاد میں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے)

(۷) الذین ہم علی صلاتہم دائمون۔ (سورۂ معارج رکوع اول) (وہ نمازی ان برائیوں میں مبتلا نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر کی آیتوں میں فرمایا گیا ہے اور وہ نمازی کیسے ہیں؟) وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی نماز پر ہمیشگی رکھنے والے ہیں یعنی برابر نماز پڑھا کرتے ہیں۔ کبھی نماز چھوڑتے نہیں۔

(۸) سورۂ ماعون رکوع اول۔ الذین ہم عن صلاتہم ساہون۔ افسوس ہے ان نمازیوں کے حال پر جو اپنی نماز سے بے خبر رہتے ہیں۔ یعنی نماز تو پڑھ لیتے ہیں مگر بے وقت، وقت کی پابندی کا خیال نہیں کرتے۔

رسم خط بدلنے کی وجہ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ۶۷ جگہوں میں سے ۵۹ جگہوں پر تو وحی کے لکھنے والوں نے صلوٰۃ واو پر کھڑا زبر دیکر لکھا نہ کہ زبر دیا، یہ سمجھکر واؤ سے لکھا کہ پڑھنے والے یہاں پر کھڑا زبر سمجھیں گے یا اس واؤ کو الف ہی پڑھیں گے۔ واو کا تلفظ کبھی ادا نہ کریں گے مگر ان آٹھ جگہوں پر جو واؤ سے نہ لکھا اور لام الف سے لکھا تو یہ ان کی بھول چوک تھی، یا بلا ارادہ اس طرح قلم سے نکل گیا، یا جیسا کہ بعض لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ بعض قبائل کی رسم خط بعض دوسروں سے مختلف تھی اور مختلف قبیلوں کے کاتب تھے، ہر کاتب نے اپنے قبیلے کی رسم خط کے مطابق لکھا، اسوجہ سے رسم خط کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس طرح کے اختلاف رسم خط کو کاتبین وحی کی غلطی یا بھول چوک یا ناواقفیت قرار دینا تو بہت بڑی گستاخی ہے جن کی توثیق و تعریف قرآن میں موجود ہے جنکو سفرۃ یعنی ماہرین فن کتابت املاء و انشاء، اور کرام بررۃ یعنی قسموں میں بزرگ اور اللہ کے نزدیک نیک کار فرمایا گیا[3]۔ ان کی شان بلند میں ایسے

---

[1] علامہ موصوف کا یہ دعویٰ محل نظر ہے۔ اس موضوع پر طلوع اسلام جولائی ۱۹۵۱ء میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جا چکی ہے۔ ملاحظہ ہو مضمون "قربانی" (طلوع اسلام)

[2] میں جہانتک سمجھتا ہوں اس آیت اور اس حکم کا تعلق نماز تہجد سے ہے صلاتک کی اضافت صاف بتا رہی ہے کیونکہ تہجد کی نماز کو نافلۃ لک فرمایا گیا ہے یعنی یہ ایک فاضل فرض خاص تم پر ہے۔ چونکہ اس نماز میں دوسروں کو قرآن سنانا مقصود نہیں اسلئے بآواز بلند پڑھنے کی کیا ضرورت، قریب پاس کے لوگ بھی آواز سن کر چلے آئیں گے ان کا دل شوق عبادت سے مجبور ہوگا مگر وہ اسکو برداشت نہ کر سکیں گے جیسا کہ سورۂ مزمل میں مذکور ہے اگر یہ حکم عام نمازوں کیلئے ہوتا تو بالصلوٰۃ بلکہ بالصّلوٰات کہا جاتا۔ صلاۃ کا واحد لفظ لانا اور پھر اسکو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا اسکی دلیل ہے کہ یہ وہی نماز ہے جو آپ پر مخصوص طور سے فرض تھی۔ رسم خط اسی لئے بدل گئی کہ صیغہ جمع نہ سمجھا جائے کیونکہ اگر صیغہ جمع سمجھا جاتا تو لوگ پنجگانہ نماز ہی سمجھتے۔ اور مخصوص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص نماز غرض رسم خط بدلکر صیغہ واحد کو معین اور حتمی کر دینا بتا رہا ہے کہ یہاں تہجد ہی کی نماز مقصود۔ واللہ اعلم بمرادہ کلامہ ۱۲ عفرلہ

[3] اس کی مفصل بحث میری کتاب تنقید احادیث جمع قرآن کے صفحہ میں دیکھئے۔ ۱۲ منہ عفرلہ

Marfat.com

خیالات نہایت افسوسناک جرأت ہے۔ باقی قبائل کے اختلاف رسم خط کا فرق، تو سوچنا یہ ہے کہ ان آٹھ مقاموں میں سے چھ مقام مکی سورتوں میں ہیں اور دو مقام مدنی سورتوں میں یعنی سورۂ انفال اور سورۂ نور تو مدنی ہیں باقی پانچ سورتیں انعام، بنی اسرائیل، مومنون، معارج اور ماعون یہ سب مکی ہیں اور مکے میں کاتبین وحی صرف قریشی ہی تھے کسی اور قبیلے کے نہ تھے اور مدنی کاتبین وحی بھی وہی تھے جنھوں نے قریشیوں ہی سے کتابت سیکھی تھی یا قریشی ہی رسم خط کے خوگر تھے۔ پھر انھیں سورتوں میں اور دوسری جگہ بھی صلوٰۃ کا لفظ واؤ سے لکھا ہوا ملتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ جو پورے سورہ میں بلکہ ہر جگہ تو صلوٰۃ کا لفظ واؤ سے لکھے وہی صرف ایک جگہ لام الف سے لکھدے۔ صرف سورۂ انعام ہی ہے جس میں دو جگہ صلاۃ لام الف سے ہے باقی ان تمام سورتوں میں صرف ایک ایک جگہ ہے حالانکہ ان ہی سورتوں میں واؤ سے صلوٰۃ کا لفظ کئی جگہ موجود ہے۔ سورۂ انعام کا نواں رکوع، انفال کا پہلا رکوع، بنی اسرائیل کا نواں رکوع اور سورۂ نور کا آٹھواں رکوع ملاحظہ کیا جائے۔ آخر کوئی وجہ ہی ہے کہ کاتبین وحی جو ماہرین فن کتابت و املا و انشا اور عند الناس کرام اور عند اللہ بررۃ (نیک کار) تھے انھوں نے ایک ہی سورہ میں ایک جگہ تو صلوٰۃ واؤ سے لکھا اور دوسری جگہ لام الف سے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

کاتبانِ وحی کی مہارتِ فن

میں نے اپنی کتاب "احادیث جمع قرآن کی تنقید" میں اس موضوع پر پوری بحث کی ہے مگر یہاں صرف کتاب النثر الفنی مصنفہ ڈاکٹر زکی مبارک المصری جلد اول ص۵۶ کی ایک عبارت میں نقل کرتا ہوں جس سے کاتبین وحی کی حذاقت و مہارتِ فن کا ثبوت ملیگا وہ لکھتے ہیں:

وکذلک یری ابن فارس ان معرفۃ القدماء من الصحابۃ بکتابۃ المصحف علی النحو الذی یعللہ النحویون فی ذوات الواو والیاء والہمزۃ والمد والقصر تدل علی فہمہم لاصول اللغۃ وقواعد الکتابۃ۔ یعنی مصنف نے جو باتیں اوپر لکھی ہیں کہ اہل عرب ماہر عربیت اور عالم فصاحت و بلاغت اور واقف اصول فن بدیع و انشاء و شعر اور فن کتابت و انشا میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ اسکے ثبوت میں وہ لکھتے ہیں کہ "اسی لئے ابن فارس اس کا یقین رکھتے ہیں کہ قدما صحابہ کی واقفیت کتابت مصحف میں اس طرح تھی جس طرح علم نحو کے علما واؤ والے، یا والے، ہمزہ والے اور مد و قصر والے کلمات میں فرق و امتیاز رکھتے ہیں اور یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ لوگ اصول لغت اور قواعد کتابت سے واقف تھے"۔ ــــ غرض کاتبین وحی رضی اللہ عنہم اجمعین نے جو ہر جگہ صلوٰۃ واؤ سے لکھا اور ان آٹھ جگہوں میں لام الف سے تو یقیناً اس کی کوئی معقول وجہ ان کی دانست میں تھی۔ بلاوجہ انھوں نے یہ تفریق نہیں کی۔

واؤ اور لام الف کے فرق کی وجہ

اس فرق کو سمجھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ جہاں جہاں صلوٰۃ کا لفظ کسی ضمیر متصل کی طرف مضاف ہوئے بغیر آیا ہے ان تمام جگہوں میں واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ان آٹھ جگہوں میں جو لام الف کے ساتھ لکھا گیا ہے یہ آٹھوں جگہیں ایسی ہیں جہاں یہ لفظ کسی ضمیر متصل کی طرف مضاف ضرور ہے۔ سورۂ انعام کے رکوع ۱۸ میں اور مومنون، معارج اور ماعون میں صلاتہم ہے اور انفال میں صلاتُھُمْ ہے۔ یعنی ان پانچ جگہوں میں ضمیر جمع مذکر کی طرف مضاف ہے اور انعام کے رکوع ۲۰ میں یائے متکلم کی طرف مضاف ہے اور بنی اسرائیل میں ضمیر واحد مذکر حاضر کی طرف۔ اور سورۂ نور میں ضمیر واحد مذکر غائب کی طرف مضاف آیا ہے۔ اور آپ یہ جانتے ہیں کہ عربی زبان میں مضاف الیہ کی ضمیر بلکہ ہر ضمیر مجرور متصل ہی ہوتی ہے منفصل نہیں آتی۔ تو اس اتصال ضمائر کی وجہ سے ان آٹھ جگہوں میں صلوٰۃ کا لفظ لام الف سے نہیں لکھا جاتا واؤ ہی سے لکھا جاتا تو اس طرح لکھا جاتا صلوٰتُھُمْ صلوٰتی، صلوٰتِکَ اور صلوٰتہٗ تو کیا صلوٰۃ کو صیغۂ جمع سمجھکر پڑھنے والے ان کو صلوٰتُھُمْ، صلوٰتی، صلوٰتِکَ اور صلوٰتہٗ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ معنوی اعتبار سے ان تمام جگہوں میں صیغۂ جمع بھی بخوبی کھپ سکتا ہے مگر ادبی بلاغت مقتضی اسی کی ہے کہ یہاں واحد کا صیغہ بحیثیت اسم جنس کے ہی لایا جائے تاکہ قلیل و کثیر دونوں پر دلالت کر سکے مگر ایسی باریک ادبی لطافت کو ہر پڑھنے والا نہیں سمجھ سکتا خصوصاً غیر عرب، اور قرآن مجید سارے عالم کیلئے آیا ہے اس کے پڑھنے والے عربی و عجمی سب ہونگے اسلئے کاتبین وحی رضی اللہ عنہم اجمعین نے ان آٹھ جگہوں میں جہاں صیغۂ واحد کا صیغۂ جمع سے التباس کا خطرہ تھا وہاں صلوٰۃ کے لفظ کو واؤ سے نہیں لکھا بلکہ لام الف سے لکھ کر ان جگہوں میں لفظ صلوٰۃ کے بصیغۂ واحد ہونے کو قطعی و غیر مشتبہ بنا دیا۔ اس کو کہتے ہیں مہارت فن کتابت و املا اور اسی کا نام ہے سفارت۔ جبھی تو قرآن مبین میں ان کو کاتبین نہیں فرمایا گیا بلکہ سَفَرَۃ فرمایا گیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو مہارت فن کتابت و املا و انشا کی سند عطا فرما دی۔

Marfat.com

دیکھئے وہی سورۂ مومنون جس کی دوسری آیت میں صلاتہم لام الف سے لکھا گیا ہے اسکی ساتویں آیت والذین ہم علی صلوٰتہم یحافظون اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے رہتے ہیں یہاں صلوٰت جمع کا صیغہ ہے اسلئے واؤ سے لکھا تاکہ بصیغہ جمع ہی پڑھا جائے غرض جہاں واحد جمع کے التباس کا خطرہ نظر آیا وہاں صیغہ واحد لفظ صلوٰۃ کو لام الف سے لکھا اور صیغہ جمع لفظ صلوٰت کو واؤ سے تحریر کیا اور جہاں لفظاً و تحریراً یا معنیً التباس کا خطرہ نہیں نظر آیا وہاں ہر جگہ صیغہ واحد کو بھی واؤ سے لکھا اور صیغہ جمع کو بھی۔ کیونکہ بغیر ضمیر سے ملائے الگ لکھیں گے تو صیغہ واحد کو گول ۃ سے لکھیں گے اور صیغہ جمع کو لمبی ت سے یعنی واحد صلوٰۃ ہے اور جمع صلوٰات اسلئے الگ لکھنے میں التباس کا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ البتہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ انعام کے رکوع ۱۱ میں ہے وھم علی صلوتہم یحافظون۔ کون سی وجہ ہے کہ وہاں صیغہ واحد ہی ادبی بلاغت کے اعتبار سے مناسب ہے کہ وہاں لام الف سے صلاتہم لایا گیا اور یہاں سورۂ مومنون کی ساتویں آیت میں صیغہ جمع ہی مناسب ہے کہ صلوٰتہم بصیغہ جمع آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں کلام میں معنوی خوبیاں پیدا کرنا ایک بلیغ متکلم کیلئے ضروری ہے وہاں سلسلۂ کلام میں تکرار لفظ سے بچنا بھی اس کیلئے ضروری ہے کیونکہ کلام کے بلیغ ہونے کیلئے اس کلام کے کلمات یعنی مفرد الفاظ کی فصاحت شرط لازمی ہے اور فصاحت کی ایک شرط لازمی یہ بھی ہے کہ اس عبارت کے کلمات میں تنافر نہ ہو اور بلاغت کی شرط لازمی ہے کہ ترکیب کلمات میں بھی تنافر نہ ہو۔ اور جو لفظ اسی سلسلہ عبارت میں ایک بار بولا جا چکا پھر دوبارہ چند ہی جملوں کے بعد اس کا اعادہ اسی طرح ضرور باعث تنافر ہے اور سورۂ مومنون کی دوسری آیت الذین ہم فی صلاتہم خاشعون میں صلاتہم کا لفظ آچکا تھا۔ اور پھر چار ہی جملوں کے بعد والذین ہم علی صلاتہم یحافظون اگر کہا جاتا تو دونوں جملوں کا عنوان بیان بھی اور صلاتہم کا لفظ بھی مکرر لایا جاتا تو کتنا برا معلوم ہوتا اسلئے دوسری جگہ یعنی ساتویں آیت میں صلاتہم بصیغہ واحد نہیں لایا گیا بلکہ تکرار سے بچنے کیلئے بصیغہ جمع لایا گیا اور کلام کو فصاحت و بلاغت کے پائے سے گرنے سے بچا لیا گیا۔ باقی رہی وہ معنوی خوبی جو صیغہ واحد اسم جنس میں بھی کہ اس کی دلالت قلیل و کثیر سب پر ہوتی ہے ایک نماز اور ایک سے زیادہ نمازیں بھی صلوٰۃ صیغہ واحد سے سمجھی جا سکتی ہیں مگر صیغہ جمع سے ایک ہی نہیں بلکہ دو بھی زیادہ ہی نمازیں سمجھی جائیں گی اور مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ نمازوں کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ دو یا دو سے کم نماز کی حفاظت کا حکم نہیں ہے، تو ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ بصورت اضافت صیغہ جمع بھی کبھی اسم جنس کے معنی میں آکر قلیل و کثیر سب پر دلالت کرتا ہے جیسے مانکح اباؤکم و ابناؤکم میں اگرچہ آباء اور ابناء جمع کے صیغے ہیں مگر اسم جنس کے معنی میں ہیں اور آباء سے باپ دادا پردادا سب اور ان میں سے کوئی ایک بھی مراد ہے اسی طرح ابناء سے بیٹا پوتا پڑپوتا سب اور ان میں سے کوئی ایک بھی سمجھا جائیگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ کُمْ کی ضمیر جمع متکلم کے سارے مسلمان مخاطب ہیں اسلئے آباء اور ابناء جمع کے صیغے آئے۔ ورنہ کسی مسلمان کے باپ یا بیٹے کی منکوحہ مطلقہ یا بیوہ سے کسی دوسرے مسلمان کا نکاح بھی جائز نہ ہونا چاہیئے۔ یہاں اگرچہ سارے مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے مگر فرداً فرداً ہر شخص کو گویا الگ الگ حکم ہے۔ یہ ایک بہت باریک ادبی نکتہ ہے اس کو غور سے سمجھنا اور یاد رکھنا چاہیئے۔

مگر ایک سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ سورہ توبہ رکوع ۱۳ میں ہے ان صلوٰتک سکن لہم۔ اور سورۂ ہود رکوع ۸ میں ہے یٰشعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد اٰباؤنا الآیہ۔ ان دونوں جگہ صلوٰۃ کا لفظ ضمیر متصل واحد مذکر حاضر کی طرف ہی مضاف آیا ہے جس طرح بنی اسرائیل کے رکوع ۱۲ میں بصلاتک ہے مگر ان دونوں جگہوں میں بصلاتک کی طرح صلوٰۃ کو الف لام سے نہیں لکھا اس کی کیا وجہ ہے؟ —— اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں جگہیں ایسی ہیں جہاں التباس کا مطلقاً خطرہ ہی نہیں۔ یہاں پر وہ شخص جو عربی زبان جانتا ہے صیغہ واحد بمعنی اسم جنس ہی پڑھیگا اور کبھی بصیغہ جمع نہیں پڑھ سکتا۔ اگر بصیغہ جمع کوئی پڑھیگا تو معنی یہ ہوں گے کہ زیادہ نمازیں تمہاری ان کیلئے باعث تسکین ہیں یعنی ایک دو نماز نہیں۔ اسی طرح حضرت شعیبؑ سے ان کی قوم نے ان کی متعدد نمازوں کے بارے میں کہا کہ تمہاری دو ایک نماز نہیں متعدد نمازیں نہیں حکم دیتی ہیں کہ ہمیں اس پر مجبور کرو کہ ہم اپنے ان معبودوں کی پرستش ترک کر دیں جنکی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے رہے اور یہ کسقدر غلط معنی ہوں گے۔ تو چونکہ ان جگہوں میں صیغہ واحد کا صیغہ جمع سے التباس کا مطلق خوف نہ تھا اسلئے ان دونوں جگہوں میں باوجود مضاف بسوئے ضمیر ہونے کے صلوٰۃ کو اس کی اصلی رسم خط سے لکھا اور جہاں التباس کا ڈر تھا وہاں لام الف سے لکھا۔ مضاف بسوئے ضمیر متصل ہونا ہی صرف رسم خط

Marfat.com

بدلنے کی وجہ نہیں ہے بلکہ خوف التباس اسکی اصلی وجہ ہے۔

قرآنی رسم خط

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی متعارف رسم خط سے اختلاف کیا گیا ہے یقیناً اسکی کوئی نہ کوئی معقول وجہ ہے۔ یہ ایک اتنا بڑا طوالت طلب موضوع ہے کہ اگر اس پر پوری بحث کی جائے تو ایک ضخیم جلد خاص اس کیلئے چاہئے۔ اس کتاب کی تکمیل کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انشاء اللہ المستعان میں اس کیلئے بھی کمر ہمت باندھ لوں گا۔ واللہ ولی التوفیق۔

ضرورت وعدۂ حفاظت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل فرمایا اور پھر اس کی حفاظت کا بھی وعدہ فرمایا تو آخر اس وعدۂ حفاظت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔

مگر اس کا جواب بھی صاف اور بالکل واضح ہے کہ اس سے قبل جتنی کتابیں جن جن رسولوں پر اتریں ان کی امتوں نے یا تو اس کتاب کو بالکل ضائع کر دیا جس طرح حضرت نوحؑ اور ان کے بعد انبیاء مرسلین کی کتابوں کا کہیں نام ونشان بھی نہیں حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کا ذکر قرآن مبین میں ہے ضرور مگر صحف ابراہیم کا وجود کہیں باقی نہیں ہے۔ اور اگر بعض رسولوں کی کتاب انکی امت کے پاس موجود بھی ہے تو وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں، کمی وبیشی، تحریف وتصحیف ان میں اس طرح اور اسقدر کی گئی ہے کہ صحیح وغلط کی تمیز محال سی ہوگئی ہے۔ خود ان کتابوں پر ایمان رکھنے والوں کو ان کتابوں کے صحیح ہونے کا یقین نہیں جیسے تورات، زبور اور انجیل۔ کہ ان کتابوں کی تاریخ خود یہود ونصاریٰ کی لکھی ہوئی دیکھ لیجئے۔

جب تک نبیوں کے بھیجنے کا سلسلہ جاری تھا ایک کتاب کے مفقود یا ضائع یا رد وبدل ہونے کے بعد دوسری کتاب ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا[1] کے مطابق (یعنی جب کبھی کوئی آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا اس کو ذہنوں سے بھلا دیتے ہیں تو دوسری آیت اس سے بہتر یا اس کے مانند اسکی جگہ اسکے بدلہ لے آتے ہیں۔ (البقرہ ۱۰۶ع۱۳)) برابر آتی رہی اور کسی کتاب کو بھی محفوظ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ جب نبیوں کے بھیجنے کا سلسلہ ختم کر دینے کا ارادہ ہوگیا اور آخری نبی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے اور ان پر آخری کتاب اتار دی گئی تو اس کتاب کو محفوظ رکھنا ضروری و لازمی تھا کیونکہ نہ اس کتاب کے بعد اب کوئی دوسری کتاب بھیجی جائیگی اور نہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی آئیگا تو پھر یہ کتاب اگر ضائع ہوگئی یا اس میں بھی تحریف وتبدیل و کمی بیشی کر دیگئی تو پھر دنیا کیلئے ذریعۂ ہدایت کیا رہیگا؟ غرض اس آخری کتاب کی ہر حیثیت سے حفاظت اور ہر تغیر وتبدل اور ہر کمی وبیشی اور ہر تصحیف وتحریف سے قیامت تک اس کو محفوظ رکھنا ضروری تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس آخری کتاب (قرآن مجید) کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔

ذمہ داری ذمہ دار کی قوت وقدرت کے مطابق ہی ہونی چاہئے

کھانا کھولے پر رکھا ہوا ہے آپ نے ایک آٹھ دس برس کے بچے سے کہا کہ دیکھنا کوئی جانور کھانے سے منہ نہ لگائے تم اسکی پوری حفاظت کرو۔ آپ یہ کہہ کر وہاں سے کچھ دور چلے گئے۔ اگر کوا، بلی یا

---

[1] یہاں اٰیۃ فرمایا گیا کتاب نہیں فرمایا گیا اسلئے کہ کوئی کتاب پوری کی پوری منسوخ نہیں ہوئی اور نہ پوری بھلائی گئی اور اسکے بعض احکام بعد کو بھی باقی رہے جیسے انجیل کے آنے کے بعد تورات وزبور کے بعض احکام اسی طرح اپنی جگہ پر رہے۔ آجتک آپ بائبل میں عہد نامۂ قدیم وعہد نامۂ جدید دیکھئے ہیں عیسائی تورات سے مستغنی نہیں ہو سکتے اسلئے وہ تورات بھی ضرور پڑھتے ہیں اور اسکے بعض غیر منسوخ احکام پر عمل کرتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید نے ہمیں اگلی کتابوں سے مستغنی کر دیا ہے چونکہ یہ کتاب اگلی کتابوں کے تمام غیر منسوخ احکام پر خود ہی حاوی ہے اسی لئے اس کتاب کو اگلی کتابوں کا مہیمن فرمایا گیا مصدقا لما بین یدیہ من الکتب ومھیمنا علیہ یعنی یہ کتاب اپنی اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان پر مہیمن یعنی نگہبانی وحاوی ہے بغیر حاوی ہوئے پوری نگہبانی نہیں ہو سکتی اسلئے نگہبانی میں حاوی ہونے کا مفہوم از خود موجود ہے اور نگہبانی اسلئے کہ کہاں اگلی کتابوں میں تحریف ورد وبدل ہوا ہے اس کا پتہ اسی کتاب سے ملسکتا ہے تو جب یہ مہیمن کی کتاب آگئی تو پھر اس کتاب کے بعد اگلی محرف کتابوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی اسلئے یہ کتاب اگلی کتابوں سے بہتر (خیراً منہا) ہے اور تورات کیلئے انجیل (مثلھا) تھی مگر پہلے (خیراً منہا) کا ذکر کیا گیا اس کے درجا ور مرتبہ میں مقدم ہونے کی وجہ سے اور پھر اس لئے بھی کہ اسوقت موضوع بحث یہی کتاب تھی۔ جو لوگ اس آیت سے قرآن ہی کی بعض آیتوں کو ناسخ اور بعض کو منسوخ سمجھتے ہیں وہ عجمیوں اور ملحدوں کے فریب میں آکر اس غلطی میں پڑ گئے ہیں۔ انشاء اللہ ناسخ ومنسوخ کی بحث آئندہ جلدوں میں سے کسی جلد میں آجائیگی اور وہ سیر حاصل بحث ہوگی ۱۲ منہ غفرلہ۔

Marfat.com

مرغا مرغی نے خوانچے کے کھانے کو خراب کیا تو ضرور آپ اس لڑکے کو الزام دینگے کہ تم نے حفاظت کا حق خوب ادا کیا اور وہ لڑکا ضرور موردِ الزام سمجھا جائیگا۔ لیکن اگر کوئی خوفناک کتا آگیا، لڑکے نے اس سے خوانچے کے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ کتا اس لڑکے ہی پر جھپٹا۔ غریب نے بھاگ کر اپنی جان بچائی مگر خوانچے کا سارا کھانا کتا کھا گیا تو کیا آپ اس لڑکے کو موردِ الزام قرار دیں گے؟ اور وہ لڑکا حفاظت نہ کر سکنے میں غفلت برتنے کا مجرم کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسلئے کہ اس خوفناک کتے کے حملے کی تاب اس لڑکے میں نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ کی قوت وقدرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کی ذمہ دارانہ حفاظت کے حتمی وعدے کو سمجھئے کہ اگر قرآن مجید کا ایک حرف، بلکہ ایک نقطہ بھی ادھر سے اُدھر ہوگیا، بدل گیا۔ اگر اس کی کوئی حرکت اسکا کوئی سکون بھی نازل شدہ حیثیت میں نہ رہا تو کیا اللہ تعالیٰ کی ذمہ دارانہ حفاظت کا وعدہ پوری طرح پورا اترا؟ کیا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کامیاب رہی؟ تو جب ایک حرف ایک نقطے، ایک حرکت اور ایک سکون کے بھی اِدھر اُدھر ہوجانے یا بدل جانے یا کم و بیش ہوجانے سے اللہ تعالیٰ کی قوت وقدرت کے پیش نظر قرآن کی ذمہ دارانہ حفاظت کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوتا تو پھر پورے کسی لفظ، کسی فقرے، کسی جملے، کسی آیت اور کسی سورۃ کے قرآن مجید سے نکل جانے اور غائب ہوجانے سے، یا بڑھا دیئے جانے سے یا کسی آیت میں تصحیف وتحریف یا تغیر وتبدل کردیئے جانے سے اللہ تعالیٰ کی ذمہ دارانہ حفاظت کا وعدہ کس طرح وفا شدہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اسلئے حفاظت الٰہی کا ذمہ دارانہ اعلان خود بانگ دہل پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ قرآن مجید ہر طرح کی تغیر وتبدیل، ہر قسم کی تحریف وتصحیف اور ہر حیثیت کی کمی وبیشی سے ہر زمانے میں، آغاز نزول سے قیامت تک محفوظ رہیگا اور اس طرح محفوظ رہیگا کہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔ باطل نہ اسکے آگے سے آسکے گا نہ اسکے پیچھے سے، یہ حکمت وحمد کے مالک کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے (حم سجدہ ع۵ پ۲۴) اسلئے جو لوگ بھی قرآن مجید کی کسی آیت میں کسی طرح کی بھی کمی بیشی یا ردوبدل کا گمان بھی رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ دارانہ وعدۂ حفاظتِ قرآن کو جھوٹا سمجھتے ہیں، ان کا ایمان ہی درحقیقت قرآن مجید پر نہیں اور جب قرآن مجید پر ان کا ایمان نہیں ہے تو پھر اللہ کے رسول پر بھی ان کا ایمان نہیں، اور جب اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب پر ان کا ایمان نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ پر بھی ان کا صحیح ایمان نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ مسلم رہنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنے اوہام باطلہ سے صدق دل سے توبہ کرنی چاہیئے اور نئے سرے سے اللہ، اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب پر ایمان لانا ان پر واجب ہے۔ ان ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلا۔ یہ ایک یاددہانی ہے جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف والی راہ اختیار کرے۔ ورنہ ما علینا الا البلاغ۔

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے   ہم نیک وبد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

حفاظت امتحانی وغیر امتحانی کہا جاسکتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اگلی امتوں نے اپنے رسول پر نازل شدہ کتابوں کو ضائع کیا۔ اس میں تحریف و تصحیف وتبدیل وتغیر کی۔ اسلئے قرآن مجید کے متعلق بھی اس کا خطرہ تھا کہ امت محمدیہ کہیں اس کو بھی ضائع نہ کردے اور اس میں بھی تحریف وتصحیف وتغیر وتبدیل نہ کرڈالے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے اسکی حفاظت کا ذمہ دارانہ وعدہ کیا۔ اور یہ وعدہ اس طرح پورا کیا کہ امت محمدیہ ہی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اسکی حفاظت کی ذمہ داری خود محسوس کریں اور اس میں کسی طرح کی کمی وبیشی اور تحریف وتصحیف گوارا نہ کریں۔ اور اس کی حفاظت کیلئے ہر ممکن تدبیر کرتے رہیں۔ اس کو حفظ کرلیا کریں، ہر زمانے میں اس کے سیکڑوں ہزاروں حافظ ہوتے رہیں۔ اسکے کلمات وحروف وحرکات وسکونات ونقاط کو گن ڈالیں وغیر ذلک۔ تو بیشک اللہ تعالیٰ نے اس طرح قرآن کی پوری حفاظت کردی اور ایسی حفاظت کردی کہ اس پر کبھی کسی دشمن کو حملے کا ارادہ بھی پیدا نہ ہوا اور نہ کبھی کسی نے اس کو ضائع کرنے یا نقصان پہنچانے کی ہمت کی۔

ایک تمثیل ایک بادشاہ نے اپنے پایۂ تخت سے ایک بڑا خزانہ کسی دوسرے ماتحت ملک میں اپنے ایک وزیر کے ہاتھ بھیجا اور راستے میں ڈاکوؤں

Marfat.com

چوروں، لٹیروں سے حفاظت کے خیال سے فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ کرنا چاہا مگر کسی پہلوان نے ذمہ لیا کہ فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے ہم تنہا اسکی حفاظت کیلئے کافی ہیں آپ مجھ ہی کو ساتھ کر دیجئے۔ بادشاہ نے اس پہلوان کو وزیر کے ساتھ کر دیا۔ مگر بادشاہ نے بطور خود بھی راہ میں حفاظت کا انتظام بنظر احتیاط کر رکھا تھا۔ وزیر اس خزانہ کو لیکر اس پہلوان کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ گیا اور جہاں خزانہ پہنچانا تھا وہاں اس نے پوری ذمہ داری کے مطابق خزانہ پہنچا دیا۔ راستے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ پیش نہ آیا اور نہ چوروں، لٹیروں یا ڈاکوؤں سے سامنا ہوا کہ اس پہلوان کی بہادرانہ حفاظت کا امتحان ہوتا۔ گو وہ برابر ساتھ ساتھ محافظ و نگراں کی طرح راہ میں رہا ضرور۔ اور کبھی فکر حفاظت سے غافل نہ رہا۔ اسکے بعد وزیر اور پہلوان دونوں بادشاہ کے پاس اپنی اپنی مفوضہ خدمات انجام دیکر آگئے۔ اس صورت میں اس پہلوان کو کوئی بھی کسی خاص انعام و اکرام و اعزاز کا مستحق نہیں کہہ سکتا۔

بخلاف اسکے کہ اگر راہ میں ڈاکوؤں نے وزیر کو مع خزانہ گھیر لینا چاہا ہو اور یہ پہلوان دونوں ہاتھوں سے اسوقت بانا گھمانے لگا ہو اور اسکے بانے کی ضرب سے متعدد ڈاکو موت کے گھاٹ اتر گئے ہوں اور متعدد زخمی ہوئے ہوں اور آخر باقی سارے ڈاکو بھاگ نکلے ہوں اور اس طرح کا واقعہ راہ میں دو چار جگہ ہوا ہو اور ہر جگہ بہادر پہلوان نے اپنی پہلوانی کے جوہر دکھا کر وزیر کی جان بھی بچائی ہو اور خزانے کو بھی لٹنے سے بچایا ہو اور پھر خزانہ ہر طرح سے محفوظ منزل مقصود تک پہنچا کر وزیر اور وہ پہلوان دونوں بادشاہ کے پاس واپس پہنچے ہوں تو اسوقت ہر شخص اس پہلوان کو مستحق صد انعام و اکرام و اعزاز قرار دیگا اور یقیناً بادشاہ اس سے بہت زیادہ خوش ہوگا۔

پہلی صورت میں وعدۂ حفاظت بغیر امتحان حفاظت پورا ہوا تھا اور دوسری صورت میں وعدۂ حفاظت امتحانِ حفاظت کے بعد پورا ہوا۔

تو اگر قرآن مجید پر کسی طرح کا حملہ ہی نہ ہوا۔ کبھی کسی نے اس کو ضائع کرنے کی اور اسکو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ امت محمدیہ توفیق الٰہی خود بخود برابر اس کی حفاظت کا سامان کرتی رہی اور یہ سب اللہ ہی کی توفیق اور اللہ ہی کی بہم رسانی اسباب کے ماتحت ہوا تو اس میں شک نہیں کہ اس طرح بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدۂ حفاظت پورا کر دیا مگر یہ حفاظت امتحانی نہ ہوا۔ یہ ذمہ دارانہ حفاظت کا اعلان تو صاف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کتاب پر بھی دشمنوں کے حملے ہوں گے اور کتنے نادان دوستوں کو اسکی ایسی دوستی کا خیال پیدا ہوگا جو دشمنوں کی دشمنی سے زیادہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر ہر حملے اور ہر ضرر سے ہم اس کو محفوظ رکھیں گے۔ یہ اس ذمہ دارانہ اعلان کے فحوائے کلام سے ظاہر ہو رہا ہے اور جب تک یہ نہ ہوا اسوقت تک یہ وعدۂ حفاظت اور اس کا ذمہ دارانہ اعلان اعجاز کا درجہ نہیں حاصل کر سکتا ——— تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی قرآن مجید پر دشمنوں نے کچھ حملے کبھی کئے یا نہیں؟ اور وہ حملے کب کب شروع ہوئے اور پھر کب کب ختم ہو گئے یا ابتک جاری ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی طرف سے دشمنوں کے ان حملوں کی کس کس طرح مدافعت فرمائی اور کس کس طرح قرآن مجید کو دشمنوں کی دشمنی اور نادان دوستوں کو مضر و مہلک دوستی کے شر سے محفوظ رکھا۔

حقیقتِ حال

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید پر جسقدر اور جس جس طرح کے حملے ہوئے بلکہ ہوتے رہے بلکہ آج تک ہو رہے ہیں اس کی مثال دنیا نہیں پیش کر سکتی۔ دنیا کی کسی چیز یا کسی شخص پر اتنے مخالفانہ حملے، متعدد محاذ قائم کرکے ہر محاذ سے مسلسل حملوں کی بوچھار اور وہ بھی آغاز نزول سے اسوقت تک یعنی اس پونے چودہ سو برس میں سے کوئی دن ایسا نہیں بتایا جا سکتا ہے جس میں قرآن مجید پر کسی نہ کسی محاذ سے حملے نہ کئے گئے ہوں۔ پہلے سولہ اقسام کے تواتر پر ایک اور تواتر حملہ، اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکی مدافعت کا تواتر بھی ملا لیجئے تو یہ سب اٹھارہ قسم کے تواتر ہوئے۔

ابتدائی حملہ

شروع شروع یعنی آغاز نزول سے عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین تک تو اسی قدر حملے ہوا کرتے تھے کہ کفار و مشرکین اس کو کذب افتراء و بہتان اور سحر و شاعری کہا کرتے تھے۔ اور اس حملے کا سلسلہ آغاز نزول سے اسوقت تک چلا آرہا ہے ہر زمانے میں کفار و مشرکین و ملاحدہ قرآن مجید پر اسی قسم کے ناپاک حملے اپنی ناپاک ذہنیت کے ماتحت کرتے رہے اور آجتک کر رہے ہیں۔ اس حملے کا تواتر تو عہد نبوی سے اسوقت تک چلا آرہا ہے کسی زمانے میں بلکہ کسی زمانے کے کسی حصے میں یہ حملہ موقوف نہ ہوا۔

Marfat.com

پہلی صدی کے بعد کے حملے

جب کفار و مشرکین کے سامنے قرآن کی تحدی (چیلنج) بار بار پیش ہوئی کہ اگر تم اس قرآن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ وحی نہیں مانتے، ایک انسان کی بنائی ہوئی کتاب سمجھتے ہو اور اس کے مضامین کو کذب و افترا، یا شاعری کہتے ہو تو پھر تم لوگ بھی اپنے بڑے بڑے شاعروں اور فصحاء و بلغاء کو جمع کرو اور ان سے کہو کہ سب مل کر ایسا ایک سورہ بھی بنا کر لے آئیں۔ اور پھر یہ بھی لکھ دیا گیا کہ اس کے ایک مختصر سے سورہ کے برابر بھی کوئی عبارت فصاحت و بلاغت میں اس رتبے کی تم لوگ کبھی نہ لا سکو گے، اگرچہ سارے شاعر اور تمام فصحاء و بلغاء باہم مل کر بھی اس کی کوشش کریں۔ یقیناً اتنے بڑے زبردست چیلنج کو سن کر عرب کے کافر و مشرک شعراء و فصحاء و بلغاء کبھی خموش نہ بیٹھے ہوں گے، ضرور اس کی کوشش کی ہوگی مگر اپنی کوششوں کو ناکام دیکھ کر اس کی ہمت نہ پڑی کہ مقابلے کے میدان میں سامنے آئیں اور ادھر قرآنی اعجاز نے اہل انصاف کے قلوب اپنی طرف کھینچنا شروع کئے، اور ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا کا منظر برابر سامنے آتا رہا کہ لوگ فوج در فوج دین اسلام قبول کرتے ہی چلے جا رہے تھے اور مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی تو ہٹ دھرموں کی ایک جماعت منافق بن کر اور اپنے کو مسلمان ظاہر کر کے مسلمانوں کو طرح طرح سے پریشان کرنے لگی اور چاہا کہ کھلے بند دشمن بن کر ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تو بظاہر دوست بن کر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ منافقین و ملاحدۂ عجم بھی فتح ایران کے بعد اواخر عہد فاروقی میں مسلمانوں میں مل کر فتنہ و فساد کے بیج بونے لگے۔ یہاں تک کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت انہی منافقینِ عجم کی سازشوں کی وجہ سے ہوئی۔ پھر اواخر عہد حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ میں منافقین عجم کی سازش سیاسی حیثیت سے اپنے شباب پر آگئی جس کا نتیجہ حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا اور پھر مسلسل خانہ جنگیاں جو جنگِ جمل و جنگِ صفین و حادثۂ کربلا و قتل ابن زبیرؓ وغیرہ فسادات کی شکل میں مسلمانوں کے درمیان ہوتی رہیں یہ سب انھیں عجمی منافقین و ملاحدہ کی فتنہ انگیزیوں کے سبب سے ہوئیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن باوجود ان تمام خانہ جنگیوں کے مسلمانوں کا دینی شیرازہ منتشر نہ ہو سکا اور ان میں کسی طرح کا قومی و اجتماعی ضعف پیدا نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر منافقین و ملاحدۂ عجم نے کافی غور و خوض کے بعد اس کو محسوس کیا کہ مسلمانوں کا شیرازۂ دینی و قومی جو کچھ ہے وہ صرف قرآن ہے جب تک یہ کتاب ان کے پاس ہے یہ کبھی شکست خوردہ نہیں ہو سکتے۔ یہ معلوم کر لینے کے بعد ان منافقینِ عجم کی ایک نہایت مدبرین و ماہرین علوم عجمیہ و عربیہ کی جماعت نے ایک سازشی پروگرام مرتب کیا جس کے ماتحت قرآن مجید کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لیا جا سکے اور اس کتاب کو ضائع و برباد نہ کیا جا سکے تو اس کو بالکل غیر مفید و بیکار بنا دیا جائے۔

اس کو وہ خوب سمجھتے اور جانتے تھے بلکہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہر مسلم گھر میں قرآن مجید کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ حافظوں کی کثیر تعداد سارے اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر گھر میں ہر مسلمان مرد عورت اور کمسن بچے بچیاں سب کے سب روزانہ اس کی تلاوت کرتے رہتے ہیں، نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ اس کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ ہر مسلم گھر میں قائم رہتا ہے ایسی چیز کو ان سے چھین لینا تو محال ہے اور اسی طرح اس کو ضائع و برباد کر دینا بھی ناممکن ہے۔ البتہ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اس کی طرف سے ہٹا کر کسی اور طرف پھیر دی جائے اور قرآن کے متعلق ایسی ایسی باتیں ان کی جماعت میں مشہور کی جائیں کہ یہ یا تو قرآن کی طرف کر شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں، یا غلط خیالات قائم کر لیں، اور ایسی صورت ان میں پیدا ہو جائے کہ یہ قرآن کو صرف عقیدۃً ہی پڑھا کریں، باقی ان کا دین و مذہبی سرمایہ اس وقت جو صرف قرآن مجید ہی ہے یہ بات باقی نہ رہے اور ان کا دین و مذہب سب قرآن سے باہر کی باتیں ہو جائیں۔ اس کے لئے اس جماعت نے متعدد محاذات قائم کئے اور ہر محاذ کے لئے قابل افراد اپنے میں سے چن کر ہر محاذ پر مقرر کئے

Marfat.com

کہ جو لوگ اس محاذ پر مقرر کیے گئے ہیں وہ اپنے محاذ سے برابر مسلسل حملے جاری رکھیں، کسی زمانے میں بھی حملے موقوف نہ کریں اور ہر محاذ سے جو حملہ بھی ہو وہ صرف قرآن ہی پر ہو۔ رسولؐ یا صحابہؓ پر بھی کچھ حملے ہوں مگر اصل ہدف قرآن ہی رہے۔

اور پھر اس کا سلسلہ قائم کیا کہ ہر محاذ کے لوگ اپنے جانشین بھی بناتے رہیں تاکہ ان کے مرنے کے بعد اس محاذ کا کام ان کے جانشین جاری رکھیں اور اس محاذ سے قرآن پر حملے کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو۔

غرض اس طرح متعدد محاذ ان منافقین ملاحدہ نے قائم کئے جن کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ دوسری جلد میں آئیگی اور ہر محاذ سے رفتہ رفتہ حملوں کا سلسلہ بڑی دانائی و ہوشمندی کے ساتھ شروع کردیا جس کا زمانہ پہلی صدی کے اواخر کا دور تھا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ واقعہ کربلا کے بعد سے مگر اللہ تعالیٰ کے حلم نے باوجود ان تمام ریشہ دوانیوں اور فتنہ سازیوں کے علم کے انھیں پورا موقع دیا کہ وہ جب تک چاہیں، جتنے محاذوں سے چاہیں اور جسقدر چاہیں قرآن مجید پر حملے کریں اور مسلسل حملوں کی بوچھار قائم کردیں اور کبھی حملوں کے سلسلوں کو منقطع نہ ہونے دیں۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے: ان الذین یلحدون فی اٰیٰتنا لا یخفون علینا ؕ افمن یلقی فی النار خیر ام من یأتی اٰمنا یوم القیٰمۃ ؕ اعملوا ما شئتم انہ بما تعملون بصیر۔ جو لوگ ہماری آیتوں کے ساتھ الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے، کیا وہ جو دوزخ میں ڈالا جائے گا اچھا ہے یا وہ اچھا ہے جو قیامت کے دن امن وامان کے ساتھ آئے گا؟ کرو جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو، تمہارے ہر عمل پر اللہ کی نظر رہتی ہے۔ (   )

غرض اللہ نے ان کو پوری ڈھیل دیدی اور اتنی لمبی ڈھیل کہ آجتک باوجود اس کے کہ بارہ سو برس سے زیادہ ہوگئے مگر ان کے وہ محاذات قائم ہیں اور اب تک ہر محاذ سے ان منافقین وملاحدہ کے حملوں کی تجدید اب زیادہ نادان دوستوں ہی کے ہاتھوں سے مسلسل طور سے برابر ہوتی رہتی ہے مگر قربان جایئے اللہ تعالیٰ کے ذمہ دارانہ وعدہ حفاظت کے کہ اس کے معجزانہ اثر سے قرآن پاک اس پونے چودہ سو برس کے بعد بھی اتنے شدید مسلسل حملوں کے باوجود بالکل اسی طرح محفوظ ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیا تھا۔ قرآنی آفتاب پر ہزار گرد وغبار اڑایا گیا مگر وہ سارا غبار گرد اڑانے والوں ہی کی آنکھوں پر پڑا اور جالے کی طرح چھایا ہوا ہے قرآنی آفتاب کا دامن ذرا بھی میلا نہ ہوسکا۔

یہ ہے قرآن مجید کی حفاظت کا وہ ذمہ دارانہ وعدہ اور اس کی معجزانہ طاقت جس کا مظاہرہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے آج اپنے اس حقیر بندے کے حقیر قلم سے کرا رہا ہے ؎

اسکی قدرت کا بھی واللہ عجب فیض ہے عام　　　ایک مچھر سے کیا قصہ نمرود تمام

مندرجہ بالا صفحات میں آپ نے تفصیل سے ملاحظہ فرمالیا کہ اعجاز القرآن کا کیا مطلب ہے عہد نبویؐ سے خلافت بنی عباس تک اعجاز کی کن کن وجوہ کا رفتہ رفتہ ظہور ہوا اور آج کے زمانہ میں قرآن کے اعجاز کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ نیز آپ نے یہ بھی بلاحظہ فرمالیا ہے کہ قرآن کریم کن کن عبارات سے متواتر ہوکر ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے تواتر کو توڑنے کیلئے جو جو حربے ملاحدہ عجم نے آجتک استعمال کئے ان کی حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ملاحدہ عجم کی اس سازش کا پردہ چاک کرنے کے لئے جو انھوں نے قرآن کریم کے خلاف مختلف محاذوں سے کھڑی کی تھی قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے چنانچہ آئندہ صفحات میں ان محاذات سے بحث کی جائے گی۔ وباللہ التوفیق۔

قرآن کے خلاف ملاحدۂ عجم کی منافقانہ سازشیں

ملاحدہ عجم جو تابعین کے لبادے اوڑھ کر منافقانہ زہد و ورع اور ریاکارانہ پابندی صوم و صلوٰۃ کے ذریعے سارے ممالک اسلام میں عوام مسلمین میں اپنا رسوخ قائم کر چکے تھے۔ اور عجمی اسیران جنگ جو غلامی سے آزادی حاصل کر کے موالی کے لقب سے مشہور تھے، ان میں سے ایک بڑی جماعت کو اپنا شریک کار بنا کر مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک زبردست سازش کے ماتحت جدوجہد میں مصروف تھے، سب سے پہلے ایک مجوسی اسیر جنگ غلام ابولولو فیروز کے ہاتھوں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو منصب شہادت تک پہنچانے کے بعد جب انتخاب خلیفہ کے وقت کوئی فتنہ برپا نہ کر سکے تو خلیفہ منتخب حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے خلاف مرکز اسلام سے دور دراز مقامات میں جا جا کر عوام میں ایسی باتیں بیان کرنے لگے جن سے عام مسلمانوں میں خلیفہ وقت کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہوں، اور اس کے لئے ضرورت اس کی تھی کہ پھر ان کے مقابل کسی دوسرے کو بھی پیش کیا جائے تاکہ عوام اگر کسی وقت موجودہ خلیفے کے خلاف شورش برپا کر کے ان کو معزول کر دیں تو پھر وہ دوسرے جب ان کی جگہ خلیفہ بنا دیئے جائیں۔ اس کے لئے انھوں نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا، اور ان کے فضائل و مناقب میں جھوٹی جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر ہر جگہ ان جھوٹی حدیثوں کو مشہور کرنا شروع کیا چنانچہ ایران کے وہ علاقے جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے میں فتح ہو چکے تھے اور کوفہ و بصرہ اور شام و عراق کے علاقوں میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت کی منقبت کی حدیثیں رفتہ رفتہ پھیلائی جانے لگیں، اور خاندان پرستی کی بنیاد اس طرح اسلام میں ڈالی جانے لگی۔ دور دراز ملکوں کے عوام سیدھے سادے مسلمان ان منافقین کو تابعین فحول اور ان کی من گھڑت حدیثوں کو واقعی حدیث رسول سمجھ کر یقین کر لیتے تھے، بلکہ ان جھوٹی حدیثوں کو یاد کر لیتے تھے اور پھر وہ بھی دوسروں سے روایت کیا کرتے تھے۔ آخر ان منافقین کوفہ بصرہ اور مصر سے ایک جماعت بلوائیوں کی مہیا کر کے آخر ماہ شوال ۳۵ھ میں ایسے وقت مدینہ طیبہ میں فتنہ برپا کرنے کے ارادے سے پہنچے جب کہ مدینے سے ایک بہت بڑی جماعت حج کے ارادے سے مکہ معظمہ روانہ ہو چکی تھی اور مدینے سے کچھ بوڑھے کچھ بچے کچھ عورتیں اور کچھ بیمار لوگوں کے سوا تقریباً کل آدمی باہر تھے، اور ان منافقین اور ان کے چیلوں نے آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر ڈالا پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو انھیں بلوائیوں نے خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا اور انھوں نے بادل ناخواستہ منصب خلافت قبول کیا، مگر ان بلوائیوں منافقوں کے سبب سے ان کو ایک دن بھی آزادانہ فرائض خلافت اپنی مرضی کے مطابق انجام دینے کا موقع نہ مل سکا۔ جنگ جمل و جنگ صفین انھیں منافقین اور ان کے تیار کئے ہوئے بلوائیوں کی وجہ سے واقع ہوئی اور پھر آخر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی انھیں ظالموں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت جام شہادت پینا پڑا۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد "باپ کے بعد بیٹا مسند خلافت پر قابض ہو جائے"، اسلام میں اس بدعت کی بھی سب سے پہلے انہی منافقین اور ان کے تیار کردہ بلوائیوں کی بدولت داغ بیل پڑی، کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے والد ماجد رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسند خلافت پر متمکن ہو جائیں۔ مگر وہ ان منافقین کے رویے سے بہت حد تک واقف ہو چکے تھے بتقاضائے

Marfat.com

مصلحت اس وقت تو فتنہ فرو کرنے کے لئے ان لوگوں کی بات مان لی، اور منصب خلافت کو بادل ناخواستہ قبول کرلیا، مگر چھ ہی ماہ کے بعد خلافت سے دست بردار ہو کر الگ ہو گئے اور مسند خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے خود سبکدوش ہو گئے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کا یہ مصلحتی فعل اور ان کی یہ عاقلانہ صلح ان فتنہ پردازوں پر بہت شاق گذری کہ اب تو فتنوں کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ اور اس کے ذمہ دار تنہا امام حسن رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لئے ایک خانگی سازش کر کے ان کو زہر دلوا کر شہید کر ڈالا۔ اور اس طرح اس مصالحت کا انتقام لیا۔ ان کی شہادت کا الزام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا یزید پر رکھنا بھی انہی منافقین کے چیلوں کا کام ہے۔ ان دونوں کا تو ان کی زندگی ہی میں فائدہ تھا ان کی شہادت ہی کی وجہ سے تو کوئی مفسدین کو اس کا موقع ملا کہ اب امام حسین رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے کھڑا کریں۔ اگر وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد زندہ رہتے تو اس وقت بھی خلافت قبول کرنے کیلئے کبھی تیار نہ ہوتے اور نہ حضرت امام حسین رض کو تیار ہونے دیتے۔ ان کی صلح جو فطرت اور مصلحانہ روش کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے کوئی وجہ ہی نہ تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا یزید کوئی بھی ان میں سے امام حسین رضی اللہ عنہ کی وفات چاہتا۔

بہر حال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے وقت تک تو ان کی شہرہ آفاق سیاست دانی و دور اندیشی کی وجہ سے ان فتنہ پردازوں کو کسی - - - - - - کامیاب فتنہ پردازی کا موقع نہ مل سکا۔ جہاں کہیں بھی ذرا سر اٹھایا وہیں کچل دیا گیا۔ مگر ان کی وفات کے بعد آخر امام حسین کو کسی طرح دعوی خلافت پر تیار کر لیا گیا اور ان کو فریب دے کر کوفیوں نے کوفے میں بلایا اور راستے ہی میں بمقام کربلا شہید کر ڈالا پھر تین برس کے بعد واقعہ حرہ ہوا۔ پھر حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کو بھی جام شہادت پینا پڑا۔ اس کے بعد پھر مسلسل کئی سال تک مسلمانوں میں خونریزیاں ہوتی رہیں مگر اسقدر سیاسی انتشار کے بعد بھی مسلمانوں کا دینی شیرازہ منتشر نہ ہوا، اور عقائد و عبادات اور اصولی اخلاق و اصولی معاملات میں سب کے سب متحد رہے، بعض فروعی اجتہادی مسائل میں کچھ شخصی اختلاف دو قاضیوں میں اگر ہوئے تو اس کو دینی انتشار نہیں کہا جا سکتا، اجتہادی مسائل میں اس قسم کے دینی اختلافات کا ہونا ناگزیر ہے۔ تفاوت فکر و عقل اور اختلاف طریق غور و فکر کے علاوہ مقام ضیق و مقام وسعت کا فرق بھی ایک ایسی چیز ہے کہ ایک ہی جیسے مسئلے میں دو جگہ دو قاضی دو طرح کے باہم مختلف فتوے اور فیصلہ کریں۔

غرض منافقین عجم کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ یہ عجب طرح کی قوم ہے کہ اس کے رسول کے دو دو داماد شہید کر دیئے گئے دو دو نواسوں کو جام شہادت پلا دیا گیا۔ پھر ان کے درمیان اتنی خونریزیاں کرا دی گئیں پھر بھی ان کا شیرازۂ قومیت ایک ہی ہے اور اتنے انتشار کے باوجود آج بھی دوسروں کے مقابل یہ سب کے سب ایک ہی ہیں، چونکہ ان سبھوں کا دین ایک ہے اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان دینی فرقہ بندیاں پیدا کر کے ان کے دینی شیرازے کو توڑ دیا جائے تاکہ ان کی مختلف جماعتیں ہو جائیں اور ہر جماعت کا دین دوسرے سے الگ اور مختلف ہو جائے کہ ایک دوسرے کو کافر ورنہ گمراہ تو ضرور کہے۔ مگر یہ دشواری بھی محسوس کی کہ اس قوم کا قومی شیرازہ صرف دین ہے اور ان کا دین ان کی کتاب قرآن میں منحصر ہے۔ قرآن میں فرما دیا گیا ہے کہ وما اختلفتم فیہ من شئ فحکمہ الی اللہ ( ) تم نے جس کسی بات میں اختلاف کیا اس کا فیصلہ اللہ کی طرف رجوع ہو کر رہے گا۔ یعنی اللہ کی کتاب قرآن تمہارے پاس موجود ہے اسکے سامنے پیش کر دو۔

Marfat.com

ہر دینی اختلاف کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔ اور اگر تم نے دنیا میں قرآن کے سامنے اپنے اختلاف کا فیصلہ نہ کیا تو پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہارے سارے باہمی اختلافات پیش ہو کر رہیں گے اور اس دن تمہارے اختلافات کا صحیح فیصلہ ہو جائے گا۔ تو جب یہ لوگ قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے ان کا اختلاف بڑی آسانی کے ساتھ مٹ جائے گا۔ اس لئے ایسی صورت نکالنی چاہئے کہ ان سے قرآن بالکل چھن جائے۔ مگر فوراً ہی اس کو بھی محسوس کر لیا کہ ان سے قرآن کا چھین لینا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ اول تو ہر گھر میں قرآن کے متعدد نسخے موجود ہیں، عورت، مرد، بوڑھے، جوان، یہاں تک کہ بچے اور بچیاں قرآن پڑھا کرتی ہیں اور روزانہ تلاوت کا معمول ہے۔ پھر تقریباً اسی فیصدی مرد اس قوم کے حافظِ قرآن ہیں۔ اس لئے اس قوم سے اس کتاب کا چھین لینا بالکل محال ہے۔ تو پھر کوئی ایسی صورت نکالنے کی ضرورت ہے کہ قرآن کے مقابل کوئی دوسری ایسی چیز ان کے سامنے پیش کر دی جائے جس کو یہ قرآن کے برابر سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس دوسری چیز کی طرف ان کی توجہ اس قدر مبذول کرا دی جائے کہ یہ قرآن سے دور پڑ جائیں اور ان کا انہماک جو قرآن کی طرف ہے وہ باقی نہ رہے۔ ان مفسدین کو ان کی سابق فتنہ پردازیوں کے درمیان اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ یہ جھوٹی جھوٹی حدیثیں فضائل و مناقب وغیرہ کی بنا بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے عام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے تو بیچارے سیدھے سادے عوام فوراً اس کو قبول کر لیتے تھے، بلکہ یاد کر لیتے تھے اور خود اس کی روایت دوسروں سے کرنے لگتے تھے اس سے ایک چیز تو ان کو یہ معلوم ہو گئی کہ ہم جو بات قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کے عوام کے سامنے بیان کریں گے عامۂ مسلمین ضرور اس کو مان لیں گے۔ اس لئے دین اسلام کے ہر رکن ہر کام اور ہر بات کو مختلف طریقے سے ان جھوٹی حدیثوں کے ذریعے مختلف کر دیا جائے تاکہ ان مسلمانوں کا عقیدہ و عمل ایک طرح سے باقی نہ رہے جب مختلف عقیدے اور مختلف طرح سے ان کے اعمال ہو جائیں گے تو ضروری ہے کہ یہ ایک قوم مختلف جماعتوں میں ان مختلف حدیثوں کی وجہ سے بٹ جائے اور پھر ایک دوسرے کو برسر غلط اور گمراہ سمجھنے لگے اور بالآخر ایک دوسرے کو کافر کہنے اور سمجھنے لگے۔ اور چونکہ حدیثیں نئی چیز ہوں گی اور ہر نئی چیز کی طرف طبائع کا رجحان عموماً زیادہ ہوا کرتا ہے اس لئے قرآن سے زیادہ لوگ حدیثوں کی طرف متوجہ ہو جائیں گے چنانچہ یہی ہوا کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا شور ان منافقین نے مچایا اور لوگوں کو جمع احادیث پر اس قدر ابھارا کہ رفتہ رفتہ تمام ممالک اسلامیہ میں سیکڑوں راویانِ احادیث اور بیسیوں جامعین احادیث پیدا ہو گئے اور لوگوں کی توجہ قرآن کی طرف سے اس قدر ہٹ گئی کہ علماء و فقہا و مفتیین وغیرہم اپنے فتووں اور فیصلوں میں قرآن سے استنباط مسائل و استدلال کے عوض حدیثوں ہی سے کام نکالنے لگے۔

بعض مخلص علماء نے حدیثوں کا اتنا بڑا طوفان دیکھ کر اس کی ضرورت محسوس کی کہ صحیح حدیثوں کو ایک جگہ مجتمع کر لیا جائے اور اس کے بعد روایتِ احادیث کا دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ یہ طوفان کسی طرح ختم ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ کو جتنی حدیثیں صحیح مل سکیں انھوں نے ان کو موطا میں جمع کر دینا چاہا۔ مگر حبیب بن حبیب جیسا کاتب ان کو ایسا ملا کہ جو بعد کو کذاب و وضاع کے نام سے مشہور و معروف ہو گیا، مگر اس کا کذب و افترا ان کے بعد لوگوں پر کھلا بھی تو کیا۔ موطا میں جو کچھ کارستانیاں وہ کر گیا وہ تو داخل کتاب رہ گئیں۔

پھر امام بخاری و مسلم و دارمی و ترمذی و ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ کے مولفین نے بھی اپنے جوہر دکھائے۔ ایک کے بعد دوسرے کو بھی جمع و تدوین کا شوق پیدا ہوا اور جس نے یہ چاہا کہ میں جو کچھ لکھدوں بس اس کے بعد جمع و تدوین کا دروازہ بند ہو، دوسرے نے اس دروازہ کو

Marfat.com

پھر کھول دیا اور کئی صدی تک جمع و تدوین کا سلسلہ جاری رہا جن حدیثوں کو اگلوں نے ناقابل قبول سمجھ کر رد کر دیا تھا بعد والوں نے ان کو قبول کر لیا۔ جس راوی پر ایک نے جرح کی دوسرے نے اس کی توثیق کر دی اور اس کی روایت مان لی۔ ایک نے کسی راوی کو کذاب و مفتری قرار دیا تو دوسرے نے کہہ دیا کہ یہ تو ایسا سچا تھا کہ اگر آسمان سے اس کو پٹک دیا جاتا تو وہ اس کو قبول تھا مگر جھوٹ بولنا اس کو کسی حال میں بھی قبول نہ تھا۔

امام شعبہ مشہور محدث نے اپنے ایک شاگرد سے کہا تھا کہ کلما تقدمتم فی الحدیث تاخرتم عن القرآن تم حدیث کی طرف جسقدر آگے بڑھو گے اسی قدر قرآن سے پیچھے ہٹتے جاؤ گے۔ ان کا یہ فرمانا اس قدر صحیح ثابت ہوا کہ تعجب ہوتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے جلیل القدر حفاظ احادیث قرآن سے اس قدر بے خبر بعض وقت کیوں نظر آتے ہیں؟

قرآن سے محدثین کی غفلت

یہاں اس کا موقع نہیں کہ اس موضوع پر بالتفصیل گفتگو کی جائے، اس لئے یہاں صرف تین مثالیں پیش کر دی جاتی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ محدثین حدیثوں میں انہماک رکھنے کی وجہ سے قرآن سے کس حد تک غافل ہو گئے تھے۔

(۱) مقدمہ صحیح مسلم میں امام مسلمؒ باب "صحۃ الاحتجاج بالحدیث المعنعن اذا امکن لقاء المعنعنین لم یکن فیہ مدلس" کے شروع ہی میں اپنے کسی ہم عصر پر حملہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "لو ضربنا عن حکایتہ وذکر فسادہ صفحاً" یعنی "اگر ہم اس کے قول کی حکایت اور اس کے فساد کے ذکر سے باز رہیں"۔ یہاں امام مسلمؒ نے "ضرب الصفح عن شیئ" کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ مقدمہ صحیح مسلم کی شرح میں صحیح مسلم کی مشہور آفاق شارح محدث امام محی الدین نواوی نے تحریر فرمایا ہے اور پھر اس کو بجنسہ ہمارے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے بھی اپنی شرح مسلم فتح الملہم میں نقل کر دیا ہے کہ ضربنا وھو صحیح وان کانت لغۃ قلیلۃ قال الازھری یقال ضربت عن الامر واضربت عنہ بمعنی کففت واعرضت والمشہور الذی قالہ الاکثرون اضربت بالالف" یعنی یہاں ضربنا کا لفظ صحیح ہے اگرچہ لغت قلیل الاستعمال ہے۔ ازہری (امام لغت) نے کہا ہے کہ ضربت عن الامر اور ضربت عنہ (دونوں) کففت باز رہا میں، رُکا رہا میں، رک گیا میں، اور اعرضت اعراض کیا میں نے، منہ پھیر لیا میں نے، قطع نظر کیا میں نے، کے معنی میں مستعمل ہے۔ مگر جو مشہور ہے جس کو اکثر لوگ بولتے ہیں وہ اَضْرَبْتُ ہے الف کے ساتھ۔

مگر نہ امام نووی کو یاد آیا، نہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ کو کہ یہ محاورہ امام مسلم نے قرآن مجید سے سیکھا تھا۔ اور قرآن مجید میں بغیر الف کے ضَرَبَ ہے یعنی باب مجرد ہی سے آیا ہے۔ ازہری نے کہاں سے لکھ دیا کہ مجرد سے قلیل الاستعمال ہے۔ مشہور اور اکثروں کی زبانوں پر الف سے یعنی باب افعال ہی سے مستعمل ہے؟ قرآن کی یہ آیت ازہری کو بھی یاد نہ آئی اور پھر مشہور اور قول اکثر کے ثبوت کے لئے شعرائے جاہلیت کے کچھ اشعار تو پیش کر دیئے ہوتے۔

سورہ زخرف کے شروع ہی میں آیا ہے جو چوتھی ہی آیت ہے کہ افنضرب عنکم الذکر صفحا ان کنتم قوما مسرفین۔ کیا ہم صرف اس لئے تمہیں نصیحت کرنے سے باز رہیں کہ تم حد اعتدال سے گزر جانے والی قوم ہو۔ اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی قراءت نُضْرِبُ

Marfat.com

بضم نون کی بھی ہو اور اس قراءت سے یہاں باب افعال ہی آیا ہو۔ مگر اول تو اختلاف قرأت منافقین کا ایجاد کردہ ہے اور اسی موضوع پر یہ کتاب ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ دوم یہ کہ قراءت متواترہ کے مقابل کسی دوسری قرأت کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سوم یہ کہ ایسی کوئی قراءت کسی قاری سے مروی ہی نہیں ہے کسی نے کبھی اَفَنَضْرِبُ یہاں بضم نون پڑھا ہی نہیں ہے۔

۱ اس محاورے کے ثبوت میں جو شعر زمخشری نے پیش کیا ہے وہاں باب مجرد اور باب افعال دونوں کا امکان ہے۔ مگر بعد کو مفعول مطلق باب مجرد ہی کا ہے اس لئے قرینہ غالب یہی ہے کہ فعل بھی مجرد ہی ہو۔ غرض امام نووی نے ازہری کا قول تو نقل کر دیا مگر قرآن کی آیت ان کو یاد نہ آئی اور نہ ہمارے شیخ الاسلام پاکستان کو یاد آئی۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب "الانصاف فی وجوہ الاختلاف" جو درحقیقت ایک مختصر سا رسالہ ہے جو ایک سرسری غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اس کے دیکھنے کے بعد ہر صاحب تمیز یہ کہہ دیگا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے قلم برداشتہ ہی اس کو لکھ دیا ہے۔ اس کا ترجمہ ۱۹۴۵ء کے اواخر مہینوں سے ترجمان القرآن (جماعتِ اسلامی کے آرگن) میں مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی کے قلم سے شائع ہونا شروع ہوا تھا میرے پاس یہاں اصل کتاب نہیں ہے اور نہ ترجمان القرآن کا وہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء کا مشترکہ پرچہ ہے جس میں اس ترجمے کی پہلی قسط چھپی تھی لیکن میں نے اس کی تنقید رسالہ البیان امرتسر مورخہ ماہ مارچ ۱۹۴۶ء میں جو شائع کرائی تھی وہ حسن اتفاق سے یہاں میرے پاس موجود ہے۔ میں اسی پرچہ البیان سے مختصراً نقل کرتا ہوں۔

مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی حضرت شاہ صاحبؒ کی عربی عبارت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:۔

> دوسری مثال بخاری و مسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کا خیال تھا کہ اگر جنبی کو غسل کے لئے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم سفر تھا، مجھ کو غسل کی حاجت ہوگئی، لیکن پانی نہ پا سکا اس لئے تیمم کی خاطر دھول میں لوٹ پوٹ لیا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کر لینا کافی تھا (یہ کہتے ہوئے) آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو اپنے منہ اور ہاتھوں پر مل لیا۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا۔ اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو ان کو اس روایت میں نظر آیا ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھہری۔ اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقے میں یہ حدیث بہت طریقوں سے مشہور ہوگئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان مانند پڑ گیا۔ اس لئے لوگ اسی پر عمل پیرا ہوگئے۔

مجھ کو اس وقت نہ تو نفس حدیث پر اور نہ اس کے مختلف طرق پر بحث کرنا ہے نہ اس کے راویوں کی تنقید کرنا ہے۔ صرف یہ دکھانا ہے کہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ اور پھر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کیا ان بزرگوں نے قرآن مبین میں تیمم کی آیتیں نہیں دیکھی تھیں؟ کہ اس روایت کو صحیح سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کر لیا اور حضرت شاہ صاحب بھی اس کو صحیح سمجھتے ہوئے اپنے بیان وجوہ اختلاف کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں؟

Marfat.com

یہ واقعہ اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یقیناً وفات نبوی کے بعد ہی کا واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو اس کا پتا صاف طور سے مل رہا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے مبارک زمانے کا واقعہ بتایا گیا ہے۔ کیونکہ یا امیر المومنین کہہ کے آپ کو مخاطب کیا گیا ہے۔

کیا کوئی شخص اس کا وہم بھی کر سکتا ہے کہ حضرت عمر و حضرت عمار رضی اللہ عنہما نے کبھی سورۂ نساء و سورۂ مائدہ پڑھی ہی نہ تھی؟ یا بے سمجھے بوجھے ہندوستانی عوام کی طرح فقط الفاظ زبان سے ادا کرتے تھے اور ان کے معانی پر کبھی غور و تدبر کرتے ہی نہ تھے؟ جب تیمم کا حکم صریح دو دو جگہ قرآن میں موجود ہے تو پھر پانی نہ ملنے کی صورت میں ترک نماز کو جائز سمجھنا اور تیمم کی اجازت نہ دینا کیا کتاب اللہ کی صریح مخالفت نہیں ہے؟ کیا ممکن ہے کہ حضرت عمارؓ اپنا واقعہ تو تیمم کے ثبوت میں پیش کریں اور قرآنِ مبین کی آیتیں پیش نہ کریں؟ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن کے صریح حکم کے بعد بھی تیمم کی اجازت نہ دیں؟۔

اور یہ حدیث جس طرح پیش کی گئی ہے یقیناً قابل رد ہے۔ اسلئے کہ حضرت عمارؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ تیمم کا بتایا وہ محض اپنی طرف سے بغیر کسی وحی کے بتایا؟ یا قرآنی آیتیں جو سورۂ نساء و سورۂ مائدہ میں تیمم کے لئے اتری ہیں ان کے ماتحت بتایا؟ اپنی طرف سے بغیر کسی وحی کے یعنی اس حکم کے اترنے سے پہلے سورۂ نساء و سورۂ مائدہ کے نزول کے قبل اگر بتایا تھا تو یہ منصب نبوت و رسالت کے خلاف ہے۔ آپ کو حکم تھا اتبع ما اوحی الیك من ربك جو وحی تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتری ہے تم اسی کا اتباع کرو۔ چونکہ اس وقت تک اس کا کوئی حکم نہیں آیا تھا کہ پانی نہ ملے اور غسل کی حاجت یا وضو کی ضرورت ہو تو کیا کیا جائے؟ اور ایسا سوال سامنے آ گیا تھا تو آپ اپنے دستور کے مطابق جواب دینے میں وحی کا انتظار فرماتے کبھی اپنے جی سے کوئی بات نہ بتلاتے۔ اور اگر تیمم کی آیتوں کے اترنے کے بعد کا یہ واقعہ ہے تو آپ صرف تیمم کر کے نہ بتا دیتے بلکہ پہلے تیمم کی آیتیں پڑھ کر سنا دیتے کیونکہ آپ کو حکم تھا بلغ ما انزل الیك من ربك۔ تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تم پر اترا ہے اسکو لوگوں تک پہنچا دو۔ پہلے حکم کتاب سنا دینا لازم تھا اس کے بعد عملاً اس کی تعلیم آپ پر فرض تھی بغیر آیت پڑھے ہوئے صرف تیمم کر کے بتا دینا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا۔ اس منصب رسالت پر الزام عائد ہوتا ہے۔ غرض قرآن مجید کی روشنی میں اگر یہ حدیثیں دیکھی جائیں تو ان کا کذب و بہتان ہونا صاف معلوم ہو جائے۔ مگر جذبۂ روایت پرستی نے ذہنوں کو قرآن مجید کی طرف سے غافل کر دیا۔ تو پھر وہ کسی حدیث کو قرآن کی روشنی میں کیوں دیکھنے لگے؟

(۳) تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۶۵ میں عکرمۃ البربری مولی ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

قال داود بن ابی هند عن عکرمة قرأ ابن عباس هذه الاية ”لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا“. قال ابن عباس لم ادر نجا القوم او هلكوا قال فمازلت ابين له حتى عرف انهم قد نجوا فكسانی حلّة۔

داؤد بن ابی ہند عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی لِمَ تَعِظُوْنَ سے شَدِیْدًا تک (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم لوگ کیوں نصیحت کرتے ہو ایسی قوم کو جس کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے) تو ابن عباسؓ نے (یہ آیت پڑھ کر) فرمایا کہ مجھ کو بالکل نہیں معلوم کہ اس قوم نے نجات پائی یا ہلاک ہو گئی تو عکرمہ نے

Marfat.com

کہا کہ میں انکے سامنے برابر بیان کرتا رہا، آخر وہ جان گئے کہ ان لوگوں نے نجات پائی تو ابن عباس نے (خوش ہوکر) مجھ کو ایک حلہ (خلعت) پہنایا۔

داؤد بن ابی ہند حضرت انس رضی اللہ عنہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وبارک وسلم کے خادم) سے حدیثیں روایت کرتے ہیں اور پھر اکابر تابعین کے شاگرد تھے شعبہ اور سفیان ثوری وغیرہما اکابر محدثین کے استاد تھے۔ اور بقول سفیان ثوری اپنے زمانے کے مفتی بھی تھے۔ پھر حافظ ابن حجر جیسے بحر العلوم اس روایت کو صحیح سمجھ کر بغیر کسی تنقید کے اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں۔ اور اس آیت کو اس کے سیاق وسباق اس کے ماقبل ومابعد سے ملاکر نہیں دیکھتے کہ واقعی حضرت ابن عباسؓ قرآن سے کیا اس قدر بے خبر تھے؟ اور عکرمہ بھی تو حضرت ابن عباسؓ کے ہی فیض یافتہ تھے وہ بھی قرآن سے اتنے بے خبر نہیں ہوسکتے۔

یہ آیت سورۂ اعراف کے اکیسویں رکوع میں ہے۔ جن بنی اسرائیل کو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں سنیچر کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا انھیں کا تذکرہ تھا۔ اس وقت بنی اسرائیل تین جماعتوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو احکام توراۃ کے پابند تھے اور حضرت داؤد کے ہر طرح مطیع وفرمانبردار تھے۔ یہ لوگ سنیچر کو مچھلی کے شکار کی ممانعت سن کر حکم مان گئے تھے اور سنیچر کے دن مچھلی کا شکار نہیں کرتے تھے دوسرے وہ سرکش لوگ تھے جو نافرمان تھے اور حیلے بہانے سے سنیچر کے دن بھی مچھلی کا شکار کرلیا کرتے تھے۔ مگر پہلی جماعت جو ایمان والوں کی تھی ان میں سے کچھ لوگ تو ان نافرمانوں اور سرکشوں سے بالکل قطع تعلق رکھتے تھے اور ترک موالات کئے ہوئے تھے اور کچھ لوگ ایسے تھے جو باوجود اس کے کہ خود سچے ایماندار تھے مگر ان سرکشوں سے آمد ورفت کے تعلقات رکھتے تھے، اور اس آمد ورفت سے ان کی غرض یہ تھی کہ ان لوگوں کو سمجھاتے رہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہیں شاید مان جائیں، اور سرکشی ونافرمانی سے باز آجائیں تو وہ ترک موالات کرلینے والے اپنے ان ایماندار بھائیوں کو سمجھاتے تھے کہ ان سرکشوں اور نافرمانوں کو تم کیوں نصیحت کرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو ان کو ہلاک وبرباد کرنے والا ہے یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔ پھر ان لوگوں کو نصیحت کرنے کا کیا فائدہ؟ تو ان لوگوں نے کہا کہ تمہارے رب کے حضور میں عذر پیش کرنے کیلئے اور اس امید پہ کہ شاید یہ لوگ اللہ سے ڈریں۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ واقعہ جو عکرمہ غریب کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا واقعی عکرمہ ہی نے بیان کیا ہے صحیح ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے ان میں سے کس جماعت کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا کہ معلوم نہیں وہ لوگ ہلاک ہوگئے یا انھوں نے نجات پائی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ سچے مومن تھے اور ان نافرمانوں سے ترک موالات بھی کئے ہوئے تھے، ان کے بارے میں تو ان کو یہ تذبذب ہو نہیں سکتا تھا۔ ان کی نجات میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ باقی رہ گئی دو ہی جماعت وہ سچے ایمانداروں کی جماعت جنھوں نے ان کافروں سرکشوں کے ساتھ تعلقات آمد ورفت بغرض وعظ ونصیحت باقی رکھے اور دوسری وہ قوم جو کافروں سرکشوں کی قوم تھی۔ اگر مراد وہ نصیحت کرنے والی جماعت ہے کہ چونکہ وہ ان کافروں کے ساتھ تعلقات آمد ورفت رکھتی تھی اسلئے کہیں یہ بھی باوجود سچے مومن ہونے کے صرف تعلقات آمد ورفت کی وجہ سے ان کافروں کے ساتھ کہیں عذاب میں مبتلا نہ ہوگئی ہو تو اس آیت کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ (   ) جو لوگ ان کافروں کو وعظ ونصیحت کرکے برائی سے روکتے تھے ان کو ہم نے نجات دیدی، بچالیا۔ کیا حضرت ابن عباسؓ نے یہ جملہ کبھی نہیں پڑھا تھا؟

Marfat.com

اور اگر ان کافروں سرکشوں کے متعلق ان کو تذبذب تھا جیسا کہ داؤد بن ابی ہند کی روایت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا نِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ الآیہ پڑھ کر یہ کہا کہ لم ادر نجا القوم او ھلکوا اس سے پتا ہی ملتا ہے کہ یہاں القوم پر الف لام عہد کا ہے اور وہی قوم مراد ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ یعنی وہی قوم جس کو اللہ ہلاک کرنے والا یا عذاب شدید میں مبتلا کرنے والا تھا۔ تو اگر کافروں کی قوم مراد ہے تو دوسری ہی آیت میں نصیحت کرنے والوں کی نجات کا ذکر فرما کر ارشاد کیا گیا ہے واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون ۔ تو پھر ان لوگوں کو جنھوں نے (اپنی جانوں پر) ظلم کیا ایک خوفناک عذاب میں ان کی بدکاری کی وجہ سے ہم نے گرفتار کر لیا۔

تو کوئی بتائے کہ حضرت ابن عباس رض کو کس قوم کے بارے میں شبہ تھا کہ خدا جانے وہ قوم ہلاک ہوئی یا اس نے نجات پائی ؟

کیا کوئی سمجھدار آدمی اس کا وہم بھی کر سکتا ہے کہ اس آیت میں عکرمہ والی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس رض جیسے جلیل القدر حبر الامۃ کو ایسا مہمل شبہ ہو سکتا ہے جو آجکل کے کسی جاہل مولوی کو بھی نہیں ہو سکتا اگر وہ کسی کا اردو ترجمہ بھی ایک بار دیکھ لے۔ مگر ایسی خلاف عقل روایتیں بھی ہمارے محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں اور وہ ان کو صحیح سمجھتے رہے۔ ورنہ ضرور اس کے خلاف عقل و مخالف قرآن ہونے پر کچھ روشنی ڈالتے۔

قرآن مجید سے عناد بعض صحابہ نے عہد نبوی میں حدیثوں کا لکھنا شروع کر دیا تھا اور وہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے تھے یا جو آپ کو کرتے ہوئے دیکھتے تھے اس کو لکھ لکھ کر جمع کرنے لگے تھے تو یہ آیتیں اتریں یا ایھا الناس قد جاء تکم موعظۃ من ربکم و شفاء لما فی الصدور و ھدی و رحمۃ للمومنین ۔ قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلك فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون ۔ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے موعظت اور سینوں کے اندر (چھپی ہوئی) جو بیماریاں ہوں ان کیلئے سامانِ شفا اور ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت (کا ذخیرہ یعنی قرآن مبین) آچکا۔ کہدو (اے رسول!) کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوا، تو ان (ایمان والوں) کو لازم ہے کہ اسی (قرآن مبین) کی خوشی منائیں وہ (یعنی قرآن مبین) اس سے بہتر ہے جو وہ (بطور خود) جمع کر رہے ہیں۔ (سورۂ یونس پ۱۱ ع۶)

اسی آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حدیثیں جمع کرنے سے منع فرما دیا اور کہا کہ لا تکتبوا عنی سوا القرآن ومن کتب عنی شیئا فلیمحہ (او کما قال) یعنی مجھ سے سن کر قرآن کے سوا اور کوئی بات نہ لکھو اور جس نے کچھ بھی لکھ رکھا ہو وہ اس کو محو کر کے مٹا دے۔ (رواہ مسلم وغیرہ) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پانچ سو حدیثیں جمع کی تھیں جن کو جلا دیا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے جمع شدہ حدیثوں کو لیکر جلا دیا اور لوگوں سے کہدیا کہ حسبنا کتاب اللہ۔

سلہ شان نزول کی روایتیں جو کتابوں میں مذکور ہیں اس آیت کی یا دوسری آیتوں کی ان میں نوے فی صدی منافقین عجم ہی کی ساختہ و پرداختہ ہیں جن کا منشا یہی ہے کہ آیت قرآنیہ کو اس کے سباق و سیاق اور مقتضا کے خلاف استعمال کرنے کا ایک ذریعہ پیدا ہو جائے۔ میں نے جو اس آیت اور اس حدیث کا باہمی تعلق پیدا کر کے دکھایا ہے وہ روایت کے بالکل مطابق ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم اپنے جی سے کوئی دینی امر و نہی نہیں بیان فرماتے تھے۔ منع کتابت حدیث کا حکم یقیناً اسی آیت کے ماتحت تھا۔ ۱۲ منہ تمنا عمادی عفرلہ

Marfat.com

ترمذی جلد دوم ص۱۱۴ میں حارث اعور سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں ایک بار مسجد میں پہنچا (غالباً یہ مسجد کوفہ تھی) تو وہاں لوگ حدیثوں کی روایت یا اس کے متعلق غور و خوض میں مصروف تھے۔ تو میں علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور میں نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین کیا آپ لوگوں کو نہیں دیکھتے کہ حدیثوں میں مصروف ہیں۔ تو انھوں نے فرمایا کہ کیا لوگوں نے یہ کام شروع کر دیا؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے بتحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یاد رکھو کہ عنقریب ایک فتنہ برپا ہوگا۔ تو میں نے عرض کیا کہ اس فتنے سے نکلنے کی کونسی راہ ہوگی؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب اللہ۔ اس میں تمہارے ماقبل والوں کی خبریں ہیں اور تمہارے بعد ہونے والی اطلاعیں ہیں اور تمہارے درمیان جو جھگڑے ہوں ان کے فیصلے ہیں۔ وہ ایک قول فیصل ہے، کوئی لایعنی بات نہیں۔ جس نے اس کو کسی ظالم جابر کے ڈر سے چھوڑ دیا اللہ اس کو ہلاک و برباد کر دے گا اور جس نے اس کے سوا کسی اور ذریعے سے ہدایت ڈھونڈھی اللہ اس کو گمراہی میں چھوڑ دے گا۔ اور وہ (یعنی کتاب اللہ) اللہ کی مضبوط رسی ہے وہی الذکر الحکیم (حکمت والی نصیحت ہے) اور وہی سیدھی راہ ہے، اس کی وجہ سے خواہشیں بہک نہیں سکتیں اور زبانیں ملتبس نہیں ہو سکتیں علما اس سے کبھی سیر نہیں ہو سکتے اور نہ بار بار پڑھنے سے وہ پرانی ہو سکتی ہے اور نہ اس کے عجائبات کبھی ختم ہو سکتے ہیں۔ یہی کتاب ہے کہ جن کی قوم والے اس کو سن کر رک نہ سکے یہاں تک کہ (اپنی قوم سے جا کر سبھوں نے) کہا کہ "ہم لوگوں نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو رشد و ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس لئے ہم لوگ اس پر ایمان لے آئے" (سورۂ جن کا آغاز) جس نے اس (کتاب اللہ) کے مطابق کہا، اس نے سچ کہا اور جس نے اس کے مطابق عمل کیا اس نے ثواب پایا اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا، انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف دوسروں کو بلایا اس نے سیدھی راہ کی طرف رستہ پایا۔ اے اعور! (حارث اعور کو مخاطب کر کے حضرت علیؓ نے فرمایا) اسی (کتاب) کو (مضبوطی سے) پکڑے رہو۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے اس طریق عمل کی وجہ سے عام صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی نے بھی جمع احادیث کا کبھی کوئی ارادہ نہیں کیا اور نہ کسی کا جمع کیا ہوا کوئی مجموعہ احادیث ان کی وفات کے بعد کسی کو ملا۔

بعض صحابہ کی جمع احادیث کی روایتیں

جہاں ہزاروں جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر ان منافقین نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیں، وہاں کچھ حدیثیں اس مضمون کی بھی بنائیں کہ فلاں صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں لکھ لکھ کر جمع کرنے کی اجازت دیدی تھی اور فلاں فلاں نے کچھ حدیثوں کے ذخیرے جمع کئے تھے جن میں سے ایک کی کتاب کا نام صادقہ تھا۔

میں نے اپنی کتاب "احادیث جمع قرآن کی بے لوث تنقید" میں اور بعض دوسرے مطبوعہ مضامین میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، اس لئے یہاں اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہدینا ہے کہ یہ بھی روایتیں ہی ہیں جو اپنے فعل جمع احادیث کو صحیح ثابت کرنے کیلئے بنائی گئیں ورنہ وہ سب مجموعے ان جامعین کی وفات کے بعد ان کے ورثا کو کیوں نہیں ملے؟ اور دوسروں نے ان مجموعوں کی نقلیں کیوں نہیں حاصل کیں۔ امام مالک کی موطا کی تو ان کے وقت میں سینکڑوں نقلیں ہو جائیں اور صحابہ کے جمع کئے ہوئے مجموعۂ احادیث

Marfat.com

اور کتاب صادقہ کی ایک نقل بھی کوئی محفوظ نہ رکھ سکے؟ حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مبارک ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے محترم نسخے اس چودہویں صدی کے اواخر تک دنیا میں محفوظ موجود ہیں، اور وہ مجموعہ احادیث جس کا نام صادقہ تھا یا اور دوسرے مجموعے جن کو صحابہ کا جمع کردہ کہا جاتا ہے وہ دوسری تیسری صدی والوں کو بھی نہ ملے؟ نہ ان کی نقل کسی نے محفوظ رکھی؟ آخر ان مجموعہائے احادیث کی طرف سے دوسرے صحابہ اور اکابر و اصاغر تابعین نے اتنی بے اعتنائی کیوں برتی؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب من گھڑت افسانے ہیں دراصل کسی صحابی نے حدیثوں کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا تھا۔ اگر دو چار حدیثیں بھی کوئی صحابی کسی ورق پر لکھ رکھتے تو وہ ورق تبرک کے طور سے ضرور محفوظ رکھا جاتا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت اور قرآنی آیت کی تنبیہ کے بعد ممکن نہ تھا کہ کوئی صحابی بھی جمع احادیث کا کبھی ارادہ کرتا۔ اسلئے یہ ساری روایتیں مصادرہ علی المطلوب ہیں۔ جمع روایات کی سند میں اپنی ہی من گھڑت روایتوں کو پیش کرنا وہ بھی ایسی روایتیں جو عقلاً و درایۃً جھوٹی معلوم ہوں کسی صاحب عقل و انصاف کے نزدیک معتبر نہیں ہو سکتیں۔

توجیہ جمع احادیث کی ممانعت کے باوجود حدیثیں جمع کرنے کی کوئی معقول سند ان کو نہ ملی تو ان لوگوں نے دوسری صدی میں یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ قرآن مجید بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جمع نہیں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے اپنے زمانہ خلافت میں جمع کرایا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حدیثوں میں چونکہ زیادہ تر آحاد ہی ہیں، یعنی صرف کسی ایک ہی صحابی کی طرف منسوب کی گئی ہیں اس لئے مخالفین جمع احادیث کہا کرتے تھے کہ خبر آحاد سے یقین نہیں حاصل ہو سکتا۔ اور جب ان آحاد حدیثوں سے یقین نہیں پیدا ہو سکتا تو پھر ان سے احکام بھی جو معلوم ہوں گے وہ قطعی نہ ہوں گے۔ تو اس کیلئے ایک صورت تو یہ نکالی گئی کہ ایک حدیث کو گھڑنے کے بعد مختلف طرق سے متعدد لوگ روایت کریں تاکہ وہ حدیث خبر مشہور کہی جا سکے، اور آحاد ہونے کے الزام سے بچ جائے۔ اور اس کا ایک زبردست اہتمام کیا کہ اس ایک حدیث کو متعدد آدمی مختلف جگہ جگہ کے لوگوں سے روایت کریں اور ہو سکے تو چند صحابہ کی طرف اس ایک قول کو منسوب کریں۔

اور دوسرا ایک الزامی جواب بھی نکال لیا کہ سورۂ توبہ کے آخر کی دو آیتوں کے متعلق یہ روایت کرنا شروع کیا کہ جب حضرت زید بن ثابتؓ حسب مشورہ حضرت فاروق اعظمؓ بحکم حضرت صدیق اکبرؓ قرآن جمع کرنے لگے (رضی اللہ عنہم اجمعین) تو سورۂ توبہ کے آخر کی دو آیتیں ان کو کسی کے پاس بھی نہ ملیں۔ صرف ابو خزیمہ یا خزیمہؓ کے پاس ملیں جو لکھ لی گئیں۔ یعنی اگر آحاد حدیثوں کو تم قابل اعتبار نہیں سمجھتے تو قرآن کی دو آیتیں بھی تو آحاد ہی ہیں، پھر ان پر ایمان کس طرح رکھتے ہو؟ پھر ایک روایت سورۂ احزاب کی بھی دو آیتوں کے متعلق اسی طرح کی بنالی جس کی پوری بحث میری کتاب جمع قرآن میں چھپ چکی ہے۔ اعادہ بے فائدہ ہے۔

جمع احادیث کا فتنہ پہلی صدی گذرنے کے دو چار برس بعد ہی شروع ہوا تھا اور اس وقت صحابہؓ میں سے حضرت عامر بن واثلہ ابو الطفیل اللیثیؓ کے سوا کوئی صحابی بھی زندہ نہ تھا۔ بلکہ شاید یہ بھی اسوقت زندہ نہ ہوں۔ حضرت ابو الطفیلؓ سنہ ۱۰۳ھ میں جس سال

Marfat.com

جنگ احد ہوئی تھی پیدا ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آٹھ برس سے زیادہ کے نہ تھے۔ ان کی وفات پہلی صدی ختم ہونے کے بعد ہوئی۔ کسی نے ۱۰۲ھ کسی نے ۱۰۷ھ اور کسی نے ۱۱۰ھ لکھا ہے۔ اس لئے قرینہ ہے کہ انھوں نے سو سے کچھ زیادہ عمر پائی۔ اور عجب کیا ہے کہ آخر عمر میں کچھ مجہول بھی ہو گئے ہوں [1]۔

غرض جمع احادیث کا فتنہ جس زمانے میں شروع ہوا تھا اس وقت اکابر تابعین اور صحابہ رضی اللہ عنہم تھے جو اس فتنے سے گھبرا رہے تھے اور لوگوں کو جمع احادیث سے روکتے تھے۔ اگر یہ حضرات جمع احادیث کو دین کیلئے مفید اور ضروری سمجھتے تو یہ کام خود کرتے اور خود اگر کرتے تو یقیناً عجمی جامعین سے بہتر طریقے سے اس کام کو انجام دیتے مگر وہ لوگ جمع احادیث کو منشائے قرآنی اور حکم نبوی کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور یقیناً جب خود اپنے لئے اس کام کو جائز نہیں سمجھتے تھے تو پھر دوسروں کو بھی ضرور جمع احادیث سے منع کرتے ہوں گے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے وہ کبھی غفلت نہیں برت سکتے تھے۔ مگر ان وضاعین و کذابین نے ان اکابر تابعین پر ظلم یہ کیا کہ ان کی وفات کے بعد انھیں کی طرف اپنی بعض روایتوں کو منسوب کرنے لگے۔

مختصر یہ کہ مانعین جمع احادیث چونکہ صرف قرآن مجید ہی کو حجت قطعی سمجھتے تھے اور لوگوں کو حسبنا کتاب اللہ کہہ کر جمع احادیث سے روکتے تھے اسلئے ان لوگوں کے دلوں میں قرآن مجید ہی سے عناد سا پیدا ہو گیا۔ ملحدین و منافقین عجم کا تو در اصل ایمان ہی قرآن پر نہ تھا اس لئے ان کے دلوں میں اگر قرآن مجید سے عناد ہوا تو کیا وہ تو شروع ہی سے قرآن و رسول اور صحابہ بلکہ سارے مسلمان سب کے در حقیقت معاند تھے مگر ان کی تیار کردہ جو راویان و جامعین احادیث کی ایک فوج گویا تیار ہو گئی تھی ان لوگوں کے دلوں میں واقعی عناد نہ ہو مگر عناد کی سی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی۔ چنانچہ آپ عبید بن السباق الثقفی کو دیکھئے کہ اس نے جمع قرآن بعہد صدیقی کی روایت کس طرح گھڑی اور پھر اس کے علاوہ بھی جمع قرآن ہی کے متعلق اس سے زیادہ گمراہ کن جھوٹی بات روایت کی جس کو عبد الکریم دیر یاقولی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور قرآن کسی چیز پر بھی کہیں لکھا ہوا نہ تھا۔ یعنی وہ ہڈی، کھال چھال پتھر اور ٹھیکری والی بات بھی نہیں۔

لوگوں کا عناد بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا کہ بعض شوخ چشم و گستاخ راویان حدیث قرآن مجید کے ساتھ گستاخیاں کرنے اور مذاق اڑانے لگے۔ چنانچہ عثمان بن ابی شیبہ الکوفی جو بہت بڑا محدث کہا جاتا ہے اور بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ یہ سب ان سے روایت کرتے ہیں۔ بخاری میں اس سے ۵۳ حدیثیں اور مسلم میں ۱۳۵ حدیثیں اس سے مروی ہیں۔ امام بخاری کے شیخ محمد بن عبد اللہ بن نمیر سے کسی نے اس کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ سبحان اللہ! ایسے شخص کے متعلق بھی سوال کیا جا سکتا ہے؟ ابو حاتم الرازی، یحییٰ بن معین وغیرہما اس کو ثقہ اور صدوق (بہت سچا) لکھتے ہیں۔ مگر قرآن مجید کے ساتھ اس کا کیا برتاؤ تھا؟ وہ بھی سن لیجئے۔ یہی ائمہ حدیث

---

[1] حضرت عامر بن واثلہ حضرت علی رضی اللہ عنہا کے ساتھ کوفے میں تھے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کوفہ چھوڑ کر مکہ معظمہ چلے آئے۔ وہیں رہے اور وہیں وفات پائی۔ شیعوں نے ان کو شیعہ مشہور کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ برابر کوفے ہی میں رہے اور کوفے ہی میں وفات پائی۔ مگر نہ یہ شیعے تھے اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کیلئے کوفے میں دلبستگی کی کوئی بات باقی رہی تھی۔ ۱۲۔ تمنا غفرلہ

Marfat.com

خود لکھتے ہیں کہ یہ سورۂ یوسف میں جو ہے جعل السقاية فی رحل اخیہ۔ یہ حضرت اس میں السقایہ کی جگہ السفینہ پڑھتے تھے۔ کوئی ٹوکتا تھا تو کہہ دیتے تھے کہ میں اور میرا بھائی (یعنی ابوبکر بن ابی شیبۃ الکوفی) عاصم کی قرأت ہم لوگ نہیں پڑھتے۔ اور الم ترکیف فعل ربك باصحاب الفیل پڑھتے تھے تو الم ترکو حروف مقطعات بنا کر یعنی الف، لام، میم، تا، ہا، کہہ کر پڑھتے تھے۔

اور کمال یہ ہے کہ سورۂ حدید میں جو فضرب بسور لہ باب ہے، اس کو بسنّور لہ باب پڑھتے تھے۔ کوئی ٹوکتا تھا تو کہتے تھے کہ حمزہ کی قرأت میرے نزدیک بدعت ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ کمال یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں جو ہے واتّبعوا ما تتلوا الشیطین علی ملك سلیمان۔ اس میں واتّبعوا بائے موحدہ کو کسرہ دے کر پڑھتے تھے۔ معاذ اللہ من تلك الخبائث۔ یعنی ماضی کے صیغے کو امر کا صیغہ بنا کر پڑھتے تھے۔ کوئی بتائے کہ یہ قرآن مجید سے کھلا ہوا عناد نہیں ہے تو کیا ہے؟ فاعتبروا یا اولی الابصار!

اور یہ ساری باتیں جامعین احادیث خوب جانتے تھے جبھی تو اپنی کتب رجال میں ان کو درج کیا ہے۔ مگر ان کی حدیثیں بڑے وثوق کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کرتے رہے۔ اتنا بھی خیال نہ کیا کہ جو شخص قرآن مجید کتاب اللہ کے ساتھ اس طرح کی گستاخیاں بالقصد کر رہا ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان باندھنے سے کب باز رہے گا؟

اسی عناد کا نتیجہ ہے جو ایسی ایسی روایتیں محدثین کی کتابوں میں آپ دیکھتے ہیں جن سے قرآن کی محفوظیت کو مشتبہ و مشکوک کرنے کی کوششوں کا صاف پتا چلتا ہے۔ چنانچہ ابن ابی داؤد و ابن رشتہ وغیرہما کی کتاب المصاحف میں خاص طور سے ایسی روایتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ ان روایتوں کی اکثریت صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ مگر جس قدر صحاح ستہ میں ہے وہی کیا کم ہے۔ اور اگر صحاح والوں نے بعض روایتوں کو گول مول الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اس کی تاویل کی جا سکے تو شارحین نے ان روایتوں کے ابہام کو دور کرکے اس مفہوم کو متعین کر دیا جس سے شک و شبہ پیدا ہو۔ جیسا کہ بخاری جلد دوم کتاب البیوع کے باب اول کی آخری حدیث عبداللہ بن محمد سے امام بخاری روایت کرتے ہیں اور وہ سفیان بن عیینہ سے وہ عمرو بن دینار سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ انہوں نے فرمایا کہ عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز زمانہ جاہلیت کے (مشہور) بازار تھے۔ تو جب اسلام (کا زمانہ) پہنچا تو لوگ (حج کے موقع پر) ان (کی شرکت) میں گناہ سمجھنے لگے۔ تو (یہ آیت) اتری "لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم (فی مواسم الحج)" حج کے موسم میں۔ فقراٴھا ابن عباس تو اس کو ابن عباسؓ نے پڑھا۔ حدیث کے معنی ظاہر ہیں کہ لوگ ان بازاروں کی شرکت کو حج کے موقعہ پر جانچوں کے لئے گناہ سمجھنے لگے تو حج ہی کے زمانے میں یہ آیت اتری۔ تو ابن عباسؓ نے ان لوگوں کے سامنے یہ آیت پڑھی۔ نفس روایت میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے مگر شارحین بخاری ابن حجر وغیرہ نے اس حدیث کے مفہوم کو اس طرح واضح طور سے لکھا ہے کہ آیت "فی مواسم الحج" کے فقرے کے ساتھ اتری تھی اور ابن عباس کی قرأت یہی تھی وہ اس آیت کو یونہی پڑھتے تھے۔ یعنی لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم فی مواسم الحج، اسی طرح وہ پڑھتے تھے۔ اگر ابن حجر وغیرہ کی یہ شرح صحیح ہے تو پھر بخاری کے دامن صحت سے یہ ایک دھبا جو دھویا جا سکتا تھا وہ بھی اور پختہ ہو کر رہ گیا۔

Marfat.com

لیکن یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے ائمہ حدیث رحمہم اللہ تو اکابر دین میں ہیں، اور ان بزرگوں کے ایمان و اسلام میں کسی طرح کا بھی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا پھران بزرگوں نے اس قسم کی رکاکتوں اور ان حدیثوں کے گمراہ کن مضامین کی طرف کیوں توجہ نہیں فرمائی؟ اور ایسی خبیث روایتوں کو اپنی کتابوں میں کیوں درج کرلیا؟

تو اس کے متعدد جوابات ہیں جو ذیل کے نمبروں میں درج ہیں۔

(۱) روایت پرستی کا طوفان اس زمانے میں اس طرح امڈا ہوا تھا کہ عقل ودرایت کے خلاف باتیں بھی جو محدثین سے عنعنے کے ساتھ یعنی عن فلاں عن فلاں کرکے ان کے سامنے بیان کردی گئیں اور سلسلۂ روایت میں ایسے راویوں کے نام ان سے بیان کردیئے گئے جو ان کے نزدیک ثقہ اور حجت تھے تو پھر یہ عقل ودرایت کو بالکل بالائے طاق رکھ کر اس روایت کو قبول کرلیتے اور اپنی کتاب میں درج کرلیتے تھے۔

ایک مسلم کے لئے جس طرح چشم دید یا قطعی تاریخی واقعے کے خلاف کوئی بات عقل ودرایت کے خلاف ہوسکتی ہے، اسی طرح اس مسلم کے لئے وہ بات بھی ضرور بلکہ بدرجۂ اولیٰ عقل ودرایت کے خلاف ہوگی جو قرآن مبین کے خلاف ہو۔ مگر جو بات قطعی ویقینی تاریخ کے خلاف ہو وہ تو مسلم وغیر مسلم سب کے لئے عقل ودرایت کے خلاف ہے۔ ایسی روایت تو کوئی غیر مسلم بھی قبول نہیں کرسکتا۔ مگر آپ دیکھئے کہ بخاری ہی میں یہ روایت موجود ہے کہ قال اللیث عن یحیی عن سعید بن المسیب وقعت الفتنۃ الاولی یعنی مقتل عثمان فلم تبق من اصحاب بدر احدا۔ ثم وقعت الفتنۃ الثانیۃ یعنی الحرۃ فلم تبق من اصحاب الحدیبیۃ احدا الخ لیث نے یحیی (بن سعید) سے انھوں نے سعید بن المسیب سے سن کے کہا کہ سعید بن المسیب نے بیان کیا کہ پہلا فتنہ شہادت حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کا واقع ہوا تھا تو اس فتنے نے بدری صحابیوں میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا اور دوسرا فتنہ یعنی واقعہ حرہ (فتنہ ۶۳ھ) جب ہوا تو اس نے حدیبیہ والوں میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا۔ الخ

اس روایت سے یہ صاف معلوم ہورہا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اسی فتنے کے سلسلے میں جو کچھ بدری صحابی تھے سب کے سب شہید ہوگئے، کوئی بھی باقی نہ بچا۔ حالانکہ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیر اور متعدد بدری صحابی اس واقعۂ ہائلہ کے برسوں بعد تک زندہ رہے اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے تو سب کے بعد ۵۴ھ یا ۵۵ھ یا ۵۸ھ میں وفات پائی ہے۔

اسی طرح واقعۂ حرہ جو ۶۳ھ میں واقع ہوا تھا اس کے بعد جبکہ یہ فتنہ بالکل فرو ہوچکا تھا اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ تھا حضرت براء بن عازب نے ۷۲ھ میں اور حضرت زید بن ارقم نے ۶۸ھ میں وفات پائی تھی اور یہ دونوں صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی صلح حدیبیہ میں شریک تھے ان کی وفات واقعہ حرہ کے ٹھیک دس برس کے بعد یعنی ۷۳ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اسی طرح شرکائے صلح حدیبیہ دو ایک اور بھی تھوڑی تلاش سے مل جائیں گے جو واقعۂ حرہ کے برسوں بعد تک زندہ رہے۔

غرض یہ روایت باوجودیکہ تاریخ صحیح ومشہور کے بالکل خلاف تھی، صرف روایت پرستی کے جذبے کے ماتحت لے لی گئی اور

Marfat.com

داخل کتاب کرلی گئی۔

(۲) دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ ہر حدیث کو حجت وسند ہی سمجھ کر نہیں لکھتے تھے، بلکہ ان بزرگوں نے کتنے راویوں کے متعلق خود اپنی کتابوں میں لکھدیا کہ یکتب حدیثہ ولا یحتج بہ یعنی اس کی حدیث لکھ لی جائے گی مگر اس کی سند نہیں لی جائیگی، اس کو حجت نہیں سمجھا جائے گا۔ اس لئے ایسی مشتبہ حدیثوں کے راویوں کو دیکھنا چاہئے کہ اس کے راوی کون کون ہیں اور ان کے متعلق اس جامع حدیث نے اپنی کتاب رجال میں کیا لکھا ہے؟

بعض راویوں کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یکتب حدیثہ للاعتبار یعنی اس کی حدیث عبرت حاصل کرنے کیلئے لکھ لی جائے ممکن ہے کہ ایسی حدیثیں انھوں نے اسی لئے اپنی کتابوں میں لکھ لی ہوں تاکہ لوگ ایسی حدیثوں کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں کہ راویانِ حدیث میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس قسم کی ملحدانہ ومنافقانہ حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اور ایسی حدیثوں کے ذریعے قرآن مجید کو مشتبہ ومشکوک کرنے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔

(۳) محدثین اپنی کتابیں بعض خوشخط لکھنے والوں کو بھی دیدیا کرتے تھے کہ وہ ان کے مسودے کو صاف کردیں، اور پھر جلد بندوں کو بھی دیتے تھے کہ وہ ان کی جلد درست کردیں، مگر منافقین وملحدین عجم کی ایک جماعت تھی جس نے کتابت اور جلد سازی کا پیشہ ہی اختیار کر رکھا تھا اور جو محدث ان کو اپنی کتاب خوشخط لکھنے کیلئے یا جلد باندھنے کیلئے دیتا تھا یہ اس کی کتاب میں گھٹاؤ بڑھاؤ اور ردوبدل کچھ اس طرح کردیتے تھے کہ ان کے اصل مسودے ہی میں اور پھر صاف شدہ میں بھی کہ الزام کا موقع باقی نہ رہے عموماً محدثین ابواب میں لکھنے کے وقت کچھ خالی سادی جگہ آخر میں چھوڑدیتے تھے کہ اس باب کے مضمون کے مطابق پھر کوئی حدیث ملے گی تو لکھدیں گے۔ ایسی سادہ چھوٹی ہوئی جگہوں میں یہ لوگ مناسب اضافے اپنی طرف سے کرکے اس سادی خالی جگہ کو بھر دیتے تھے محدثین کے تلامذہ میں داخل ہو ہو کر کتنے ملاحدۂ عجم ان کے ساتھ رہ کر ان کے مسودات میں اس طرح تحریفیں کرتے رہتے تھے اور استاد کی وفات کے بعد تو اس کے مسودات پر قابو حاصل کرکے بڑے اطمینان سے ان میں حسب دلخواہ ترمیم وتنسخ کرکے پھر اس کی خوب خوب اشاعت کرتے تھے اگر کہیں کسی دوسرے ساتھی نے ان کو ٹوکا کہ تمہارے یہاں اس طرح ہے مگر ہمیں تو شیخ نے یوں بتایا تھا یا تمہاری اس حدیث کو جو تم بیان کررہے ہو ہم نے شیخ سے کبھی نہیں سنا۔ تو اس کا جواب وہ یوں دیتے تھے کہ تم ہی نے سننے یا لکھنے میں غلطی کی ہوگی اور اپنی حدیث کی تصدیق اپنے کسی دوسرے شریک سازش سے اس کے سامنے کراکے اس کے صحیح لکھے ہوئے کو بھی محرف کرادیتے تھے۔

(۴) امام بخاری کی کتاب تو بادنیٰ تامل معلوم ہوجاتی ہے کہ یہ ایک محض مسودہ تھی جس کے ابواب تک کو وہ مندرجہ ابواب حدیثوں کے مطابق نہ کرسکے۔ عنوان باب کچھ ہے اور حدیثیں کچھ ہیں۔ بعض جگہ صرف عنوان باندھ کر رہ گئے ہیں اور اس باب میں کوئی حدیث ان کو نہ ملی۔ بعض جگہ صرف باب لکھ کر رہ گئے نہ کوئی عنوان ہے نہ کوئی حدیث ہی اس باب میں مندرج ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم کو بھی دیکھئے کہ مؤلف نے نہ کہیں کوئی باب لکھا نہ باب کا عنوان قائم کیا۔ صرف حدیثیں لکھتے چلے گئے

بعد والوں نے اپنی طرف سے باب قائم کر کے اس کا عنوان بھی باندھ دیا۔

اگر یہ کتابیں ان مولفین نے اپنی زندگی میں مرتب و مدون کر لی ہوتیں تو یقیناً دنیا میں ان کتابوں کا کوئی نہ کوئی نسخہ بدست خاص مؤلف کا لکھا ہوا ضرور ہوتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مبارک ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے تو آج تک موجود ہیں۔ مگر امام مالک کی لکھی ہوئی موطا، امام بخاری کی لکھی ہوئی صحیح بخاری، اور امام مسلم کی لکھی ہوئی صحیح مسلم دنیا کے کسی حصے میں پائی نہیں جاتی۔ آج ہی نہیں بلکہ چار پانچ سو برس پہلے کے لوگ بھی تو کہیں لکھتے کہ ہم نے ان مولفین و جامعین احادیث کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی ان کی کتابیں فلاں جگہ دیکھی تھیں، یا فلاں کے پاس موجود ہیں۔ اگر واقعی ان بزرگوں نے اپنی کتابیں اسی طرح جس شکل میں آج ہم لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں خود بدست خاص مرتب و مدون کر دی تھیں تو ان کے ہاتھوں کے وہ مرتب و مدون نسخے آخر کیا ہو گئے؟

غرض یہ سمجھنا کہ ان بزرگوں نے جان بوجھ کے قصداً ایسی گمراہ کن روایتیں اپنی کتابوں میں اس لئے درج کیں کہ لوگ قرآن مجید کے متعلق شک و شبہ میں پڑیں، درحقیقت ان بزرگوں ہی پر نہیں بلکہ انصاف و صداقت پر ظلم ہے۔ سب سے پہلے تو یہی امکان ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں ایسی گمراہ کن روایتوں کو داخل ہی نہیں کیا، نہ ان کو اس قسم کی روایتوں کی کچھ خبر تھی۔ ان کے بعض مفسد شاگردوں نے یا کاتبوں نے یا ورّاقوں نے اس قسم کی حدیثیں گھڑ گھڑ کر ان کی کتابوں میں داخل کر دیں۔ اور اسی کا زیادہ قرینہ ہے۔ میرا ایک مستقل رسالہ ہے جو عربی میں ہے جس کا نام "البراغیث من الوراقین وکتاب الاحادیث" جس میں تقریباً ڈیڑھ سو کاتبوں اور وراقوں کا حال درج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انشاء اللہ اس کا ترجمہ کر ڈالوں گا تا کہ اردو داں حضرات بھی ان لوگوں سے واقف ہو جائیں۔ انشاء اللہ المستعان۔

دانستہ و نادانستہ عناد متقدمین یعنی وہ منافقین عجم جو فتح ایران کے جوش انتقام میں ایک زبردست سازش کے ماتحت قرآن مجید کے ساتھ معاندانہ برتاؤ کر رہے تھے اور ہر ممکن کوشش سے عامۂ مسلمین میں قرآن مجید کی طرف سے بے توجہی و غفلت پیدا کر کے ان سے قرآن کو معطل کرا دینے کا تہیہ کر چکے تھے وہ تو کچھ دنوں کے بعد دنیا سے رخصت ہو کر وہاں پہنچ گئے جہاں ان کو پہنچنا چاہئے تھا، مگر ان کے جانشینوں کی جماعت تیار ہو گئی تھی جو ان کے مشن کو چلانے میں ان کی زندگی تک ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی، اور ان کے بعد ان کے مشن کو اسی سرگرمی کے ساتھ چلاتی رہی اور یہ سلسلہ جانشینوں کا صدیوں تک جاری رہا۔ یہ لوگ تو دانستہ قرآن رسول ازواج مطہرات رسول اور خلفائے راشدین و عامہ صحابہ کے خلاف افترا و بہتان میں مصروف تھے اور منہمک رہے۔ اور اکثر افترا و بہتان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب کرتے تھے یا امہات المومنین یا خلفائے راشدین یا عام صحابہ کی طرف۔

مگر ایک جماعت ہر زمانے میں ان سادہ لوحوں کی بھی رہی جو ان منافقین کے ریاکارانہ زہد و ورع اور پابندی صوم و صلوٰۃ سے متاثر ہو کر ان کی ہر روایت کے ساتھ حسن ظن رکھنے کے سوا اپنی روایت پرستی کی وجہ سے کوئی چارہ ہی نہیں سمجھتی اور اپنے

حسن ظن اور اپنی روایت پرستی کے سبب سے ان معاندانہ روایتوں سے متاثر ہوکر رہی اور ایک طرح کا نادانستہ پوشیدہ عناد ان بچے مسلمان راویان احادیث و مخلص جامعینِ حدیث کے دلوں میں بھی گھر کر کے رہا۔ چنانچہ آپ جامعین احادیث میں سے بعض کو تو صاف محسوس کرلیں گے کہ اس کے دل میں قرآن مجید سے ضرور عناد تھا، جیسے ابن ابی داؤد اور ابن رشتہ وغیرہ جن لوگوں کی کتاب المصاحف مشہور ہے۔ یہ لوگ بظاہر قرآن کی خدمت کرگئے کہ جتنی روایتیں قرآن کے متعلق ملیں سب کو ایک جگہ مجتمع کرگئے۔ مگر دراصل انھوں نے منافقین وملاحدۂ عجم کی من گھڑت روایتوں کا انبار لگا کر شک وشبہ کا ایک اتنا بڑا پہاڑ اپنے خیال میں قائم کردیا کہ جو شخص ان کی کتاب کو دیکھے اور تھوڑا بھی صداقت کا حسن ظن ان کی طرف سے رکھتا ہو تو اس کا شیشۂ ایمان اس پہاڑ سے ٹکرا کر چور چور ہوکر رہے۔ جبھی تو ابن ابی داؤد کے والد ماجد جامع سنن ابی داؤدؒ نے کہا تھا کہ میرا بیٹا بڑا جھوٹا ہے اور بعض دوسرے محدثین نے کہا کہ ابن ابی داؤد کے متعلق کسی دوسرے سے مت پوچھو ان کے باپ ہی کی شہادت ان کے متعلق کافی ہے۔

باقی اکابر محدثین ان میں عناد کا رنگ تو نہیں معلوم ہوتا۔ مگر ان معاندین کے ساتھ ان کو غلو یا حسنِ ظن اس حد تک تھا کہ ان کی معاندانہ حدیثیں ان کو معاندانہ معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں اور عناد ان کو عناد نظر ہی نہیں آتا تھا۔ حُبُّكَ الشيءَ يُعمي ويُصِم انسان کو کسی کی محبت اس کے متعلق اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ نہ وہ اس کے عیب کو دیکھتا ہے، نہ کسی دوسرے سے سنتا ہے۔ اسلئے اگر واقعی ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں خود اس قسم کی حدیثوں کو داخل کیا ہے، صحیح سمجھ کر تو یقیناً وہ روایت پرستی کے جوش میں ان منافقین و ملحدین عجم کو چونکہ بظاہر عابد و زاہد و متقی پاتے تھے اور ان سے سینکڑوں ایسی حدیثیں وہ لے چکے تھے جن میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش ان کے نزدیک نہ تھی، ان کی صداقت کا سکہ ان کے دلوں پر جم چکا تھا اس لئے وہ ان معاندین کو معاند تو کسی طرح سمجھ ہی نہیں سکتے تھے ان کی معاندانہ حدیثوں میں بھی عناد کا جو نمایاں رنگ جھلک رہا تھا ان کو مطلقاً نظر نہ آیا اور صرف ایک روایت ایک حدیث سمجھ کر اس کو بھی اپنی کتاب میں درج کرگئے۔

جلال الدین سیوطیؒ نے اتقان میں جو اس قسم کی معاندانہ روایتوں کو بھی داخل کرلیا ہے وہ اسی حیثیت سے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ انھوں نے ایک مورخ ایک محدث کی حیثیت سے مخالف وموافق ہر طرح کی روایتیں جمع کردیں، یہ فرض ناظرین کا ہے کہ ان روایتوں میں قوی وضعیف، صحیح وغلط اور خطا وثواب کی تمیز خود کرلیں تو یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ وہ ایک مسلم تھے ایک عالمِ دین تھے، وہ ان سب کتابوں کو لوجہ اللہ لکھ رہے تھے اور اس تصنیف وتالیف کو دین کی خدمت سمجھتے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ ہر ایسی حدیث کو جس سے قرآن پاک کا دامن محفوظیت لوث اشتباہ وشکوک سے ملوث ہوتا نظر آتا، یا تو اس کو لکھتے ہی نہیں اور لکھا تھا تو ایسی سب حدیثوں کو موضوع وبہتان قرار دیکر صاف لکھدیتے کہ یہ حدیثیں منافقین کی من گھڑت ہیں اور گنجائش پاتے تو ان کے راویوں کی تنقید بھی کرکے دکھادیتے۔ مگر وہ ایسا کس طرح کرتے، وہ تو انھیں حدیثوں کے راویوں سے سینکڑوں احکام کی حدیثیں لے چکے تھے، اگر ان راویوں کو مجروح بتاتے تو پھر وہ احکام والی حدیثیں کب قابل اعتبار رہتیں اور پھر جب وہ لوگ ان کے نزدیک قابل اعتبار تھے تو صرف احکام کی حدیثیں ان سے لیتے اور قرآن کے متعلق جو کچھ وہ روایت کررہے تھے اس کو کس طرح

ردکرتے؟ خصوصاً جب ان کے نزدیک ان حدیثوں سے قرآن مجید کے دامن محفوظیت پر کوئی دھبا آہی نہیں رہا تھا۔

بے اعتنائی بیں عناد کی جھلک

اگر محدثین اتنا ہی کرتے کہ جن راویوں کو ثقہ وحجت وسند سمجھتے تھے، صرف انھیں راویوں سے جس طرح احکام کی حدثیں لیتے تھے مجروحین سے احکام کی حدثیں لینے میں احتیاط برتتے تھے اسی طرح قرآن مجید کے متعلق بھی جس قسم کی بھی حدثیں ملتیں ان کو بھی انھیں ثقہ وحجت وسند راویوں ہی سے قبول کرتے اور مجروحین سے کبھی قبول نہ کرتے جب بھی قرآن کے متعلق افترا وبہتان کا اسقدر انبار نہ لگتا، اور وہ ثقہ وحجت رواۃ ایسی بے تکی حدثیں کبھی روایت نہ کرسکتے۔

مگر محدثین نے قرآن مجید کی اہمیت مطلقاً محسوس نہ کی اور قرآن کے متعلق تفسیری حدثیں، اختلاف قرات کی روایتیں، اور شانِ نزول کے اقوال ایسے ایسے وضاعین وکذابین سے نہایت اطمینان کے ساتھ لئے جن سے احکام کی حدثیں لینے میں ہمیشہ احتیاط کرتے رہے اور جن کے وضاع وکذاب ہونے کا خود اپنی کتب رجال میں اعتراف کرتے رہے۔

ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۲ صـ۱۲۴ ترجمہ جویبر بن سعید میں لکھتے ہیں کہ قال ابوقدامۃ السرخسی قال یحیی القطان تساھلوا فی اخذ التفسیر عن قوم لا یوثقونھم فی الحدیث ثم ذکر الضحاك وجویبرا ومحمد بن السائب وقال ھؤلاء لا یحمل حدیثھم ویکتب التفسیر عنھم۔ یعنی ابوقدامہ سرخسیؒ نے کہا کہ یحیی بن سعید القطان نے فرمایا کہ لوگوں نے بے اعتنائی برتی ایسی قوم سے تفسیر قبول کرنے میں جن لوگوں کو وہ حدثیوں میں قابل وثوق نہیں سمجھتے، پھر ذکر کیا ضحاک بن مزاحم، جویبر بن سعید اور محمد بن السائب الکلبی کا اور کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حدثیں برداشت نہیں کی جاتیں، مگر ان سے تفسیریں لکھی جاتی ہیں۔

یہ تو خود محدثین کا اعتراف ہیں نے نقل کیا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تفسیری روایتوں میں بس صرف یہی تین شخص مجروح ہیں ان کے سوا اور راویانِ تفسیر ایسے نہیں ہیں، جی نہیں۔ راویانِ تفسیر میں سے بطور مشتے نمونہ از خروارے، یحیی بن سعید القطانؒ نے یہ تین نام پیش کئے ہیں۔ تین آدمیوں کو قوم نہیں کہتے۔ وہ ایسے راویانِ تفسیر کی ایک قوم فرما گئے ہیں اور مثال کے طور پر تین مشہور راویانِ تفسیر کے نام بتادیئے۔ ورنہ اسمعیل بن عبدالرحمٰن السدی، مقاتل بن سلیمان بھی اسی تفسیری دنگل کے برابر کے جوڑ والے پہلوان ہیں، فرق ہیں اتنا ہے کہ جویبر بن سعید، محمد بن السائب الکلبی اور اسمعیل بن عبدالرحمٰن السدی یہ تینوں کوفی ہیں اور ضحاک بن مزاحم اور مقاتل بن سلیمان یہ دونوں خراسانی ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ عجمی منافقین کی سازش کا پہلا مرکز خراسان ہی برسوں تک رہا بلکہ صدیوں رہتے اور دوسرا سب سے بڑا مرکز کوفہ صدیوں تک رہا۔

ابتدائے کار وتعیین محاذات

منافقین عجم نے جب یہ دیکھا کہ نہ ہم قرآن کو مسلمانوں سے چھین سکتے ہیں نہ اس کتاب کو برباد وضائع کرسکتے ہیں تو اس کی کوشش کی کہ مسلمانوں کو قرآن سے چھین لیں یعنی مسلمان خود قرآن کو چھوڑ بیٹھیں تو اس کیلئے انھوں نے قرآت کے خلاف باہمی مشورے سے متعدد محاذ قائم کئے۔

(۱) محاذ کتابت: یعنی یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ اہل عرب بالکل امّی یعنی جاہل تھے لکھنا پڑھنا مطلقاً جانتے ہی

نہ تھے۔ سارے عرب میں آغازِ اسلام کے وقت صرف سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے عرب میں لکھنے پڑھنے کا سامان بھی نہ تھا۔ کاغذ کا تو وجود ہی نہ تھا۔ ہڈی، پتھر، ٹھیکری، کھال چھال وغیرہ پر لوگ لکھ لیتے تھے۔

لکھنے والے جو چند تھے بھی وہ قواعدِ فنِ کتابت و انشاء و املاء و رسم خط وغیرہ سے واقف نہ تھے تو سکھوں کی طرح بے پابندی رسم خط کچھ لکھ لیتے تھے۔ وغیرہ ذلک۔

یہ سب باتیں اسلئے مشہور کی گئیں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ سامان کے نہ ہونے کی وجہ سے اور لکھنے والوں کی کمی کے سبب سے پورا قرآن رسول اللہ صلعم کے زمانے میں کتابی صورت میں جمع نہ ہو سکا۔

اس کے علاوہ سب سے بڑا ظلم یہ کیا گیا کہ کاتبینِ وحی جن کی تعریف قرآن میں آئی ہے جن کو قرآن میں کِرَامٍ بَرَرَةٍ فرمایا گیا ہے یعنی وہ پبلک میں بھی محترم و بزرگ تھے اور اللہ کے نزدیک بھی نیک کردار تھے۔ ان کے متعلق یہ مشہور کیا کہ یعنی کاتبِ وحی منافق تھے جو بعد کو مرتد ہو گئے۔ آپ ان سے لکھواتے تھے علیم حکیم اور وہ لکھ دیتے تھے سمیع علیم وغیرہ۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ رہ جائے کہ قرآن مجید واقعی صحیح لکھا گیا یا نہیں۔ جس طرح آپ نے بتایا اسی طرح لکھا گیا یا اس میں کچھ رد و بدل کر دیا گیا۔ اور اس کاتبِ وحی کے مرتد ہونے کی اور پھر مسلمان ہو جانے کی ایک من گھڑت داستان بنا کر مشہور کی گئی اور اس طرح دوسرے کاتبینِ وحی کی بھی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی گئی۔

سب سے بڑا سبب عہدِ نبوی میں قرآن کے جمع نہ ہو سکنے کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ نزولِ وحی کا سلسلہ وفات کے وقت تک جاری تھا اور معلوم نہ تھا کہ کب کونسی آیت اتر آئیگی اور اس کو کس سورہ میں کس آیت کے بعد اور کس آیت کے قبل لکھنے کا حکم ہوگا اس لئے عہدِ نبوی میں پورا قرآن کیسے مرتب ہو سکتا کہ کوئی سورہ بھی مرتب نہیں سمجھی جاسکتی تھی۔ اسی لئے عہدِ نبوی میں جب جتنی آیتیں اتریں اتنی آیتیں کسی ہڈی یا تختی یا پتھر یا ٹھیکری وغیرہ پر لکھ لی گئیں اور ان کی کوئی باضابطہ ترتیب قائم نہیں کی گئی۔

ان سب شیطانی وسوسوں کا نہایت مدلل جواب میں نے اپنی کتاب جمع قرآن میں لکھ دیا ہے جن کے دیکھ لینے کے بعد کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اسلئے ہم یہاں ان سب جوابوں کو دہراتے نہیں ہیں کہ اس کتاب کا حجم بڑھ نہ جائے۔

۲۔ مصاحفِ جمع اس پر میری پوری کتاب جمع قرآن لکھی جاچکی ہے۔ اسلئے اس موضوع پر بھی یہاں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے وہ کتاب چھپ چکی ہے اگرچہ مستقل طور سے کتابی صورت میں نہیں چھپ سکی۔ طلوعِ اسلام بابت اگست و ستمبر ۱۹۵۲ء کے مشترکہ پرچے میں چھپی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا فتنہ یہ پیدا کیا گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ترتیبِ نزول کے مطابق قرآن جمع کیا تھا اور عبداللہ بن مسعود کا جمع کیا ہوا قرآن بایک خاص ترتیب سے تھا جو موجودہ ترتیب سے بہتر تھا۔ اگر وہ ابن مسعود والا نسخہ موجود تھا تو مجاہد مفسر صاحب کو قرآن کی بہت سی آیتوں کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قرآن کی ترتیب عبارت خود اپنا مطلب واضح کر دیتی۔ اور اس ترتیب متواتر کا نام مصحف عثمانی رکھا گیا کہ اس کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب

Marfat.com

حضرت عثمانؓ نے قائم کی یعنی رسول اللہ صلعم کی وفات کے تقریباً بیس برس کے بعد۔

یہ سب انہی منافقوں کی شیطانی تلبیسیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ترتیب نزول کے مطابق کوئی قرآن بطور خود مرتب کیا تھا، نہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کوئی مصحف موجودہ مصحف متواتر سے مختلف تھا۔ نہ حضرت عثمانؓ نے کسی مصحف کی بھی ترتیب آیات وسور قائم کی۔ تمام سورتیں اپنی آیتوں کے ساتھ مرتب عہد نبوی ہی سے چلی آرہی تھیں ہر سورہ کا نام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔ آپ برابر بڑی بڑی سورتیں اور چھوٹی چھوٹی بھی نمازوں میں پڑھا کرتے کبھی دو دو سورتیں لیک ایک رکعت میں پڑھتے تھے اور صحابہ کی اکثریت کے پاس کتابی صورت میں پورا قرآن مرتب موجود تھا۔ نزول وحی قرآنی کا سلسلہ آپ کی وفات سے بہت پہلے ختم ہوچکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفات کا وقت معلوم نہ ہو یہ ممکن ہے مگر اللہ تعالیٰ کو تو معلوم تھا۔ آپ کو کتاب اللہ کی تبلیغ و تعلیم و تبیین کے لئے اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا، جب تک پورا قرآن اتر نہ لے اور وہ کتابی صورت میں مرتب و مدون نہ ہو جائے اس وقت تک اس کو ذلک الکتٰب کس طرح کہا جا سکتا تھا۔ آپ کس چیز کی تبلیغ و تعلیم و تبیین فرماتے۔ اور جبتک آپ اپنے فرائض رسالت و نبوت سے سبکدوش نہ ہولیں اللہ تعالیٰ آپ کو وفات کیوں دینے لگا، خصوصاً جب آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی و رسول اس کو بھیجنا نہیں ہے۔ اسی لئے تو صحابہ آپ سے پوچھتے تھے کہ قرآن کتنے دنوں میں ختم کریں؟ اگر پورا قرآن مرتب ہی نہ تھا تو ختم قرآن کی مدت کے متعلق سوال ہی بے معنی تھا۔

آپ صحابہؓ کو منع فرماتے تھے کہ قرآن ساتھ لیکر سفر میں نہ نکلو کہیں دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اگر قرآن کتابی صورت میں مرتب و مدون صحابہ کے پاس نہ تھا تو کس چیز کے سفر میں ساتھ لیجانے سے منع کیا گیا تھا؟

آپ صحابہ کو کتاب دیکھ کر تلاوت کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے اور زبانی پڑھنے سے کتاب دیکھکر پڑھنے کا دونا ثواب بتاتے تھے۔ اگر لوگوں کے پاس کتابی شکل میں قرآن نہ تھا تو کتاب دیکھکر تلاوت کی ترغیب کس طرح دی جاتی تھی۔

آپ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی مصحف ترکے میں چھوڑ جائے تو اس کے ورثا جب اس کے بعد اس مصحف میں پڑھیں گے تو اس مردے کو بھی اس تلاوت کا ثواب ملے گا جس نے وہ مصحف ترکے میں چھوڑا تھا۔ لیکن وہ مصحف کتاب کی شکل میں نہ ہوگا تو ترکے میں کونسی چیز چھوڑی جائے گی؟

آپ کے زمانہ میں کچھ لوگ مصحف لکھنے کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے، جو لوگوں کے لئے مصاحف لکھا کرتے تھے اور لوگ اجرت دے کر ان سے مصاحف لکھواتے تھے جس کی آپ نے اجازت دیدی تھی۔ اگر اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا یا لکھنے پڑھنے کا سامان نہ تھا اور پورا قرآن مرتب ورقوں میں نہ تھا تو ان پیشہ ور کاتبوں سے کونسی چیز لکھواتے تھے؟

حضرت علیؓ کا ترتیب نزول کے مطابق جمع کیا ہوا قرآن تو اس لئے دنیا سے ناپید ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسکو چھپا دیا اور اپنے ورثہ میں سے صرف اپنے بعد ہونے والے امام کو چھپا کر بطور امانت دیا کہ دیکھو کسی کو دکھانا نہیں اور نہ کبھی اس کے مطابق پڑھنا اور اپنے بعد ہونے والے امام کو تم بھی اسی طرح بطور امانت رازداری کے ساتھ محفوظ طور سے

Marfat.com

دیدیا اور اس کے سلسلہ کو برابر بارہویں امام تک قائم رکھا کہ جب وہ غار سر من رآئیں چھپ جائیں تو اس مصحف کو بھی ساتھ لیے جائیں۔ جب قیامت کے قریب ظاہر ہوں تو اس وقت اس قرآن کی اشاعت کریں۔ یہی شیعوں کا عقیدہ ہے۔ تو شیعوں کے عقیدے کے مطابق یہ وجہ ہے کہ دنیا میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جمع کردہ قرآن کہیں نظر نہیں آتا۔ مگر وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والا اور حضرت ابی بن کعب والا قرآن دنیا سے کیوں غائب ہو گیا؟ بقول راویان کوفہ جب حضرت عثمانؓ نے اپنا ترتیب دیا ہوا قرآن تمام ملکوں میں بھیج کر ہر جگہ حکم بھیجدیا کہ اس کے خلاف جتنے نسخے قرآن کے ہوں وہ ضائع کر دیئے جائیں تو اس وقت سب لوگوں نے تو اپنے اپنے مصحفوں کو حضرت عثمان کے بھیجے ہوئے مصحف کے مطابق کر لیا اور جو مصحف کسی کے پاس ایسا تھا جو حضرت عثمانؓ کے مصحف سے زیادہ مختلف تھا اس کو اس نے ضائع کر دیا۔

مگر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردان کوفہ کو حکم دیا کہ خبردار دیکھو تم لوگ اپنے مصاحف کو مصحف عثمانی کے مطابق کرکے خراب نہ کرو۔ ان کے شاگردان کوفہ کے پاس تو وہی مصاحف تھے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کے مطابق تھے تو جب عبداللہ بن مسعودؓ جیسے استاد کا حکم تھا اور اسی بنیاد پر عبداللہ بن مسعودؓ نے نہ خود اپنا مصحف بدلا نہ اپنے شاگردوں کو بدلنے دیا جب تو کوفے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کی سینکڑوں نقلیں نہیں تو بیسیوں تو ضرور ہونی چاہئیں مگر کیا ہے آج ہی نہیں ایک ہزار برس سے کہیں کوئی نسخہ عبداللہ بن مسعودؓ کے نسخے کے مطابق نہیں ملا اور نہیں ملتا۔ اتقان میں یا فہرست ابن ندیم شیعی میں صرف ایک فہرست منافقین کی بنائی ہوئی پیش کر دینے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ واقعی اس ترتیب سور کے مطابق کوئی مصحف دنیا میں کبھی تھا۔ اسی طرح مختلف ترتیبیں سورتوں کی قائم کی جاسکتی ہیں اور آج بھی جس کا جی چاہے قائم کرے۔ مگر اس ترتیب متواتر کے خلاف کوئی دوسرا نسخہ دوسری ترتیب سے لکھا ہوا کہیں دکھانا چاہیے جو قدیم نسخہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے؟ کوئی جعلی نسخہ پرانے کاغذ پر لکھکر دکھانے کی سند نہیں۔

(۱۳) محاذِ حفظ | اس سے بھی انکار کیا جاتا ہے کہ پورے قرآن کے حفاظ کا وجود ہی نہ تھا۔ اسلئے کہ پورا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک مرتب و مدون ہی نہیں ہوا تھا۔ تو سب سے پہلا سوال تو یہی ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے قرآن کے حافظ تھے یا نہیں؟ فبہت الذی کفر۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن کے کچھ حصے کسی کو کچھ حصے کسی کو یاد تھے۔ جنگ یمامہ میں عہد صدیقی جو ستر حفاظ شہید ہوئے تھے وہ بھی ایسے ہی تھے۔ ان میں سے کسی کو پورا قرآن یاد نہ تھا بلکہ ان کو کتنی ایسی آیتیں یاد تھیں جو دوسروں کو یاد نہ تھیں اور نہ کسی کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ ان کی شہادت جو ہوئی تو وہ آیتیں بھی جو صرف انھیں کو یاد تھیں انھیں کے ساتھ دنیا سے چلی گئیں۔ خدا جانے ان میں کون کون احکام تھے جو ہمیشہ کے لیے کھو گئے اور دین مکمل کئے جانے کے بعد بھی ناقص ہی رہا۔ معاذ اللہ من ذلک۔

راویان احادیث کا حافظہ تو اتنا قوی ہو جائے کہ کئی کئی لاکھ حدیثیں مع اسناد وہ یاد کر لیں اور یاد رکھیں مگر صحابہ کا حافظہ اتنا کمزور تھا کہ وہ پورے سات ہزار بھی نہیں چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ ۶۶۶۶ آیتیں جو ایک سو چودہ ۱۱۴ سورتوں کی شکل میں مرتب ہیں ان کو یاد کر لیں

اور یاد رکھ سکیں۔

محدثین کو حدیثیں یاد کرنے کی جتنی فکر تھی اس سے کہیں زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن مجید کے ساتھ شغف تھا اور وہ قرآن یاد رکھنے کی ضرورت ان سے کہیں زیادہ محسوس کرتے تھے۔ ان کے پاس تو ان کا سرمایۂ ایمان صرف قرآن ہی تھا سنت رسول جس کو بعد والے کہتے ہیں وہ تو اسی پر چل رہے تھے وہ سنت نبوی کی چلتی پھرتی تصویریں تھے ان کو حدیثوں کے یاد رکھنے کی کیا ضرورت تھی اگر وہ حدیثوں کی کوئی اہمیت سمجھتے تو ضرور حدیثوں کو بھی کتابی صورت میں مدون کر جاتے ان کو تو جمع احادیث میں کوئی دشواری بھی پیش نہ آتی۔ نہ راویوں کی جانچ پڑتال کی ضرورت تھی۔ صحابی اگر پوچھتے تو کسی دوسرے صحابی ہی سے۔ صحابی اگر روایت کرتے تو دوسرے صحابی ہی سے۔ بڑی آسانی کے ساتھ نہایت صحیح صحیح حدیثیں جمع ہو جاتیں مگر انھوں نے اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی بلکہ جمع احادیث کو دین میں ایک فتنہ سمجھ کر اس سے باز رہے اور دوسرے جمع کرنے والوں کو اس سے منع کیا اور اپنے سامنے کہیں کوئی مجموعۂ حدیث جمع نہ ہونے دیا۔

(۴) محاذ قراءت

میری اس کتاب کا موضوع بھی محاذ قراءت ہے کہ بہت بڑا اور نہایت سخت فتنہ انگیز محاذ ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں اس اصل محاذ پر کچھ لکھوں مناسب ہے کہ کم سے کم دوسرے محاذوں کا ذکر بھی کر دوں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے خلاف کتنے محاذ قائم کئے گئے۔ چار محاذوں کے نام تو آپ سن چکے۔

(۵) محاذ ناسخ و منسوخ

یعنی اس کا پروپاگنڈا کہ قرآن کی بعض آیتیں منسوخ ہیں۔ ایک جماعت نے یہ کہا کہ قرآن کو قرآن ہی منسوخ کر سکتا ہے یعنی ایک آیت دوسری کسی آیت ہی سے منسوخ ہو سکتی ہے۔ دوسرے نے کہا کہ متواتر حدیثیں بھی قرآن کی کسی آیت کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ تیسری جماعت نے کہا کہ مشہور حدیثوں سے بھی قرآن کی کوئی آیت منسوخ ہو سکتی ہے۔ اس اختلاف باہمی کی ایک پوشیدہ غرض یہ بھی کہ علما کے درمیان یہ بحث چھڑ جائے کہ قرآن صرف قرآن ہی سے منسوخ ہو سکتا ہے یا حدیث سے بھی منسوخ ہو سکتا ہے۔ تاکہ یہ سمجھا جائے کہ قرآن کی بعض آیتوں کا منسوخ ہونا تو فریقین کے نزدیک مسلم ہے اسلئے اس کو تو ماننا ہی پڑے گا۔ باقی رہا یہ کہ ناسخ بھی قرآن کی کوئی آیت ہی ہو یا حدیث بھی ناسخ آیت ہو سکتی ہے بس صرف اسی میں اختلاف ہے۔ اب اگر کوئی شخص سرے سے نسخ ہی کا انکار کر دے تو یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ شخص تو اجماع امت کا مخالف ہے۔

اور پھر مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا والی آیت اور وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ والی آیت کا غلط مفہوم بیان کر کر کے قرآن کی بعض آیتوں کو زبردستی منسوخ ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی جاتی رہی اور آج تک کی جا رہی ہے۔

اس موضوع پر میرے متعدد مضامین ہیں جو مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ ایک مولوی صاحب سے تحریری مناظرہ بھی اس موضوع پر ہوا تھا۔ آخر وہ بحث میرے چار سوالوں پر ختم ہو گئی اور وہ مولوی صاحب اور ان کے اعوان و انصار سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ تین سوالات حسب ذیل ہیں۔

(ا) قرآن مجید میں کتنی آیتیں قائلین نسخ کے نزدیک بالاتفاق منسوخ ہیں ان کی صحیح تعداد بتائیے۔

(ب) ان متفق علیہ آیات منسوخہ میں سے کم سے کم پانچ آیتیں معین کر کے پیش کیجئے۔

Marfat.com

(ج) آیاتِ منسوخہ پر عمل کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اپنی اور اگلے قائلین نسخ کی رائے بتایئے۔
(د) قرآن کی وہ کون کون آیتیں ہیں جن پر عمل کرنا ناجائز ہو، ایسی دو تین آیتیں پیش کیجئے۔

اس کے بعد جب کوئی مجھ سے نسخ بعض آیات قرآنی پر کچھ بولتا ہے، میں یہی چاروں سوال اس کے سامنے پیش کر دیتا ہوں، اور پھر ان کو چپ ہی ہو جانا پڑتا ہے۔

(۶) مجازِ لغت

قرآن مجید کے بعض الفاظ غریبہ کے معنی بیان کرنے میں اہل لغت نے بھی کچھ کم ظلم نہیں کیا ہے۔ بعض الفاظ کے تو ایسے معانی لکھدیئے ہیں جو قرآن میں مراد لیئے ہی نہیں جا سکتے، اور اگر کوئی معنی ایسے بھی لکھدیئے کہ وہ مراد ہو سکتے ہیں مگر ایک طرح کی رکاکت باقی ہی رہ جاتی ہے یا غلط معنی لکھدیئے جس کی وجہ سے آیت کا مفہوم ہی غلط ہو جاتا ہے۔

جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لغت کی کتابیں بہت بعد میں مدون ہوئی ہیں۔ پہلے حدیث و تفسیر کی کتابیں لکھی گئیں جن میں زیادہ تر انھیں منافقین عجم کے اقوال منافقانہ تھے انھوں نے بعض الفاظ غریبہ کے معانی بھی غلط لکھے۔

مثلاً کَلٰلَۃ کے معنی خدا جانے کہاں کہاں سے دس عدد بتائے ہیں۔ قرآن میں کلالہ کا لفظ دو جگہ وراثت کے سلسلے میں سورہ نساء میں آیا ہے۔ ان دس معنی میں سے زیادہ تو ایسے ہی ہیں جو قرآن کی کسی آیت کے موقع پر بھی چسپاں نہیں ہو سکتے۔ بعض معنی تاویل صحیح ہو سکتے ہیں اور جو مفسرین غلط روایات کی بنا پر اس کے معنی من لا ولد لہ ولا والد لکھدیئے ہیں یعنی جس میت کے نہ والدین ہوں نہ اولاد وہی کلالہ ہے۔ بس اسی کو تمام اہل لغت نے بھی لکھ دیا حالانکہ قرآن مبین نے خود کلالہ کی تعریف بیان کر دی ہے کہ امرؤ هلك ليس له ولد وله اخ او اخت۔ یعنی قرآن یہ بتاتا ہے کہ جس لاولد میت کے وارث بھائی یا بہن یا دونوں ہوں تو وہ میت کلالہ ہے یعنی مورث ہونے کی حیثیت سے کلالہ ہے تو پھر وہ بھائی بہن وارث ہونے کی حیثیت سے کلالہ ہیں اور ان کی وراثت بھی کلالہ کہی جا سکتی ہے۔ اس قرآنی تعریف کا جس طرح مفسرین و محدثین و فقہا کہیں ذکر نہیں کرتے اسی طرح اہل لغت بھی کہیں ذکر نہیں کرتے۔

اسی طرح تِلَاوَۃ کا لفظ جب کتاب یا مصحف کے لئے آئے گا جیسے یتلوا صحفا مطھرۃ تو اس سے مراد کتاب دیکھکر پڑھنا ہی ہوگا۔ اسی لئے مفسرین کو اس آیت کی تفسیر میں دشواری محسوس ہوئی اور انھوں نے اس کو مجاز قرار دے کر لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زبانی اس طرح پڑھتے تھے جیسے کوئی کتاب دیکھکر پڑھتا ہو۔ وغیر ذلک۔ دیکھئے تفسیر کبیر امام رازی وغیرہ۔ اگر تلاوت کے معنی کتاب دیکھکر پڑھنا نہ ہوتا تو مفسرین کو اس قسم کی تاویلوں کی ضرورت نہ پڑتی۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تادم وفات ان پڑھ انھیں منافقین کے پروپاگنڈے کے زیر اثر تسلیم کر لیا گیا ہے تو جب آپ کو ان پڑھ مان لیا ہے اور پھر قرآن میں یتلوا صحفا موجود ہے جس کے معنی کتاب دیکھکر پڑھنے کے ہیں لہٰذا وہ لوگ تاویل پر مجبور ہوئے حالانکہ قرآن ہی سے ثابت ہے کہ نزول قرآن کی بدولت آپ کو پڑھنے کی صلاحیت منجانب اللہ پیدا ہو گئی تھی بغیر اس کے کہ آپ کسی انسان سے تعلیم حاصل کریں۔ میں نے اس کی دلیل پوری بحث کے ساتھ اپنی کتاب جمع قرآن میں لکھدی ہے۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو یہ مشہور کیا گیا کہ آپ تا دمِ وفات ان پڑھ ہی رہے اس میں ان منافقین کا ایک پوشیدہ مقصد یہ تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ آپ قرآنی آیات جو کاتبینِ وحی سے لکھواتے تھے تو آپ کو ذاتی طور سے اس کا علم الیقین نہ تھا کہ جو کچھ آپ نے لکھوایا وہی لکھا گیا یا اس میں کسی قسم کا ردوبدل ہو گیا۔ کاتبینِ وحی کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ بعض کاتبینِ وحی نعوذ باللہ منافق تھے آپ ان سے لکھواتے تھے کچھ اور وہ لکھ دیتے تھے کچھ اور۔ اور خود آپ کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ آپ پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ دونوں کے پیشِ نظر رکھنے سے ایک خالی الذہن انسان اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ آپ نے جو لکھوانا چاہا ممکن ہے کہ نہ لکھا گیا ہو اور قرآن میں کاتبین کی بے اعتمادی کی وجہ سے ردوبدل واقع ہو گیا ہو۔

حالانکہ قرآن مجید میں صاف طور سے موجود ہے کہ وما کنت تتلوا من قبلہ من کتٰب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون ہ اور تم اس (قرآن کے نزول) سے پہلے کسی کتاب کو پڑھ نہیں سکتے تھے اور نہ تم اپنے داہنے ہاتھ سے لکھ سکتے ہو۔ (اگر تم پہلے سے لکھنا پڑھنا جانتے) تو یہ باطل پرست لوگ (تمہارے متعلق) شک شبہے میں رہتے (عنکبوت ۵) یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ پڑھنے کی عدمِ صلاحیت نزولِ قرآن سے پہلے تک تھی۔ ورنہ من قبلہ کا لفظ نہ ہوتا۔ اور جب عدمِ صلاحیت کے ذکر میں من قبلہ کی قید لگا دی گئی تو اسی سے ثابت ہو گیا کہ من بعدہ یعنی نزولِ قرآن کے بعد صلاحیت پیدا ہو گئی۔ یہ تو قرآنی دلیل ہے اور بخاری وغیرہ کی حدیثیں جو پہلے پہل نزولِ وحی کی کیفیت بیان کی گئی ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بار بار معانقے والی، اس سے بھی اس کا ثبوت واضح طور سے ملتا ہے کہ جب تک کوئی کتاب کوئی تحریر پیش کر کے اس کے پڑھنے کیلئے نہ کہا جاتا ایک ان پڑھ آدمی یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ ما انا بقاری میں پڑھنے والا یعنی پڑھنے کی صلاحیت رکھنے والا نہیں ہوں۔

غرض تلاوۃ کا لفظ جب اس طرح آئے کہ اس کا مفعول "کتاب" یا "مصحف" یا "صحف" کا لفظ آئے تو اس سے مراد حرفوں کو پہچان کر کتاب دیکھ کر پڑھنا ہی ہوگا۔ بلکہ قراءۃ کے لفظ کا بھی یہی حال ہے۔ یقرؤا لکتب کے معنی یہی ہوں گے کہ کتاب دیکھ کر حروف پہچان کر پڑھنا ہے۔ البتہ آیات کا لفظ اگر مفعول ہو تو وہ عام ہے زبانی پڑھنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور کتاب دیکھ کر پڑھنے کے لئے بھی۔ چاہے قراءۃ کا لفظ اس کیلئے آئے یا تلاوۃ کا لفظ۔

اسی طرح اِدّٰرکٗ کا لفظ ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک تو سورۂ اعراف ۳۸ میں حتی اذا ادّارکوا فیھا الایہ اور دوم سورۂ نمل ۶۶ میں بل ادّٰرک علمھم فی الاخرۃ۔ اہلِ لغت اس لفظ کے جو معنی لکھتے ہیں اس سے کوئی ایسا ایک مفہوم نہیں نکلتا جو دونوں جگہ انشراحِ قلب کے ساتھ قبول کر لیا جاسکے چونکہ یہ کتاب بحرف اختلافِ قرأت کے موضوع پر ہے اور ان نوادرات کا ذکر ضمناً کر رہا ہوں اس لئے ضمنی بحثوں کو طول دینا نہیں چاہتا۔ اشارات سے کام نکالنا چاہتا ہوں۔ اہلِ علم کے لئے یہ بحثیں ہیں اور وہ خود بہت کچھ جانتے ہیں اور لغت کی کتابیں دیکھ سکتے ہیں تو پھر میں کتبِ لغت کی عبارتیں نقل کر کے ایک ضمنی بحث کو طول کیوں دوں۔ مختصر یہ ہے کہ میں ادّٰرک کا ترجمہ کرتا ہوں جھک جانا، جھکا جانا، جھوک دیا جانا۔ ان دونوں آیتوں میں اس لفظ کا یہ ترجمہ نہایت صحیح و مناسب ہوتا ہے۔ حتی اذا ادّٰرکوا فیھا یہاں تک کہ جب سارے اہلِ دوزخ، دوزخ میں جھکا دیے گئے،

Marfat.com

جھونک دیئے گئے، یعنی ان میں کوئی بھی دوزخ سے باہر نہ رہا"۔

اور بل ادّٰرك علمهم في الآخرة کا ترجمہ ہوا "بلکہ ان کا علم جھکا گیا، جھونک دیا گیا آخرت کے بارے میں یعنی ان کے سارے معلومات اور تمام ذرائع علم سب کے سب آخرت کے دریافت حال میں جھونک دیئے گئے، صرف کردیئے گئے۔ کوئی بھی ایسا ذریعہ علم نہ رہا جو اس کوشش میں صرف نہ کیا گیا ہو۔ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْهَا باوجود سارے معلومات وذرائع علم جھونک دینے کے، کیا وہ آخرت کے متعلق کچھ علم حاصل کرسکے؟ کچھ بھی نہیں) بلکہ وہ اس کے متعلق (ابھی تک) شک ہی میں پڑے ہوئے ہیں (کہ واقعی آخرت کی بھی کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟) بل هم منها عمون (شک ہی میں مبتلا نہیں ہیں) بلکہ وہ آخرت کے متعلق بالکل اندھے ہیں یعنی جس طرح آنکھیں بذات خود بغیر کسی خارجی روشنی کے کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔ جہاں اندھیرا ہو وہاں ہر شخص اندھا ہی ہے۔ آنکھوں کی بینائی خارجی روشنی کی محتاج ہے، اسی طرح عقل بھی وہاں اندھی ہے جہاں اس کو حواس خمسہ میں سے کسی کی روشنی نہ ملے۔ آخرت کے متعلق انسانی حواس خمسہ کسی طرح کی روشنی بہم نہیں پہنچا سکتے تو پھر انسانی عقل کا آخرت کے متعلق اندھی ہونا لازمی ہے اس لئے کس قدر صحیح فرمایا گیا کہ بل هم منها عمون بلکہ وہ آخرت کے بارے میں بالکل اندھے ہیں۔

اہل لغت ادّارك کا مادہ "درك" قرار دیتے ہیں۔ درك کے معنی ہیں تہ تک، آخری حد تک پہنچا۔ کھوج کھوج کر کسی چیز کا ایک ایک قدر دیکھ پکڑ کر کسی چیز میں جھونک دیا گیا تو اس کو اِدّٰرَكَ سے تعبیر کیا گیا کہ تلاش اور دھر پکڑ میں آخری حد تک سرگرمی دکھائی گئی۔ مگر ضَرَكَ کو بھی اس کا مادہ کہا جاسکتا ہے یعنی باب افتعال پر ضرك جب آیا تو ضرك کا "ضاد" اور افتعال کی "تا" دونوں "دال" ہوکر مدغم ہوگئے اور اضترك سے اِدَّرَكَ بن گیا جس کا ماضی ادرك ہوا۔ اس کے بعد اس کو باب اِفَّاعَلَ يَفَّاعَلُ پر لایا گیا تو اِدَّارَكَ يَدَّارَكُ ہوگیا جیسے ثَقُلَ کو باب افتعال پر لایا گیا تھا تو اثتقل ہوا تھا۔ تائے مثناۃ کو بھی ثائے مثلثہ سے بدل کر دونوں میں ادغام کر دیا گیا تو اثّقل ہوگیا۔ اس کے بعد باب اِفَّاعُلْ پر لایا گیا تو اِثَّاقَلَ يَثَّاقَلُ ہوگیا۔ یہ صورت بھی قرین قیاس ہے، خصوصاً معنوی حیثیت سے کیونکہ ضرك کے معنی ہیں صَارَ ضَرِيكًا وہ ضریک ہوگیا اور ضریک کے معنی اندھے اور احمق، فقیر بدحال، بعض اعضاء سے محروم وغیرہ کے ہیں۔ اس لئے اِدَّارَكَ کے معنی ہوئے اندھا ہوگیا۔ احمق ہوگیا۔ فقیر بدحال ہوگیا اور بعض اعضا سے محروم ہوگیا۔ یہاں اِدَّارَكَ علمهم فرمایا گیا ہے جس کے معنی ہوئے کہ ان کا علم اندھا ہوگیا۔ احمق بن گیا۔ جو یہاں نہایت مناسب حال ہے۔ اس طرح کی تبدیل حروف عربی کلمات میں بہت ہوتی ہے۔ یہاں یہ کوئی نئی اپج نہیں ہے۔ تُزَمِّلْ اور مُدَّثِّرْ کی لغوی نوعیت کو دیکھئے جس کی تصریح خود مفسرین و اہل لغت نے لکھ دی ہے۔ یہاں درك ہی اس کا مادہ چونکہ تسلیم کرلیا گیا اسلئے دوسری طرف ذہن نہیں گیا۔ درك ہی کو مادہ قرار دیں تب بھی صورت ترکیب وہی ہے کہ اس کو باب افتعال پر لاکر تائے افتعال کو دال سے بدل کر دونوں دال میں ادغام کر دینے کے بعد اِدَّرَكَ بنا جس کا ماضی اِدَّرَكَ ہوا۔ اس کے بعد اس کو باب اِفَّاعُلْ پر لائے تو اِدَّارَكَ يَدَّارَكُ کی نوعیت قائم ہوئی۔ میری اس بیان کردہ تبدیل و تغییر حروف پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو بہر حال ہے غرض جو کچھ ہے وہ اس کا کہ اہل لغت اس کا مادہ درك بتاتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ اس کا مادہ ضرك بھی ہوسکتا ہے جو معنوی حیثیت یہاں انسب ہے۔ واللہ اعلم۔

Marfat.com

البتہ سورۂ اعراف میں جو اِدّٰارَکوا ہے اس کا مادہ درَکَ ہی ہے۔

(۷) مجازِ صَرف و نَحو

صرف و نحو دو علوم ہیں صرف کا تعلق کلماتِ مفردہ کے اشتقاق و اوزان وغیرہ سے ہے جیسا کہ ابھی اِدّٰرَکَ کے متعلق اس سے پہلے میں نے بحث کی کہ یہ درکَ سے مشتق ہو سکتا ہے اسی طرح ضربَ سے بھی مشتق ہو سکتا ہے یہ بحث علم صرف کی تھی مگر لغوی تحقیق کے سلسلے میں یہ بحث مجاز لغت میں کی گئی۔ خصوصاً اس لئے کہ اس بحث کا تعلق مجاز مخالفت سے نہ تھا بلکہ ایک تحقیق تھی۔

مجاز صرف و نحو کے ذریعے اختلاف قرأت کا خوب خوب کام لیا گیا ہے۔ صرفی و نحوی بحثوں کو گویا اختلافِ قرأت کے لئے علتِ مادی بنا کر ان سے کام لیا گیا۔ مثلاً یحسَبون اور یحسَب جہاں جہاں قرآن مجید میں ہے بفتح سین ہے۔ اس باب کا مضارع بکسر سین بھی آتا ہے اس لئے ایک قرأت ان لفظوں کی بکسر سین بھی قرار دیدی گئی۔ کُذِبُوا کی ایک قرأت کُذِّبُوا وغیرہ بہت بنائی گئی ہے جس کا مقصد قرآن مجید میں لفظی اختلافات ثابت کرنا ہے اور کہیں کچھ معنوی فرق بھی

اوزان کے متعلق بھی مثالیں ملتی ہیں مثلاً اسم آلہ مِفعَلٌ کے وزن پر بھی آتا ہے اور مِفعَالٌ کے وزن پر بھی۔ مفعل کی جمع مَفاعِل آتی ہے اور مفعال کی جمع مفاعیل۔ یعنی مفعال کا الف جمع بنانے کے وقت یائے تحتانی سے بدل جاتا ہے چونکہ جمع کا عین مکسور ہے کسرہ کے بعد الف ساکن جب آئے گا تو اس کو یائے معروف سے بدل دینا ضروری ہے۔ الف تو ہمیشہ ساکن ہی رہتا ہے مگر میں نے عوام کے سمجھنے کے لئے ساکن کی قید لگا دی۔ الف متحرک تو در اصل ہمزہ ہے الف نہیں۔

غرض اس قاعدے کے مطابق مثقال کی جمع مثاقیل اور مضراب کی جمع مضاریب ہی آئے گی۔ کبھی مثاقل اور مضارب نہیں آسکتی تو پھر مفتاح کی جمع جب آئیگی تو مفاتیح ہی آئے۔ مفاتح نہیں آسکتی مگر سورۂ نور کے آٹھویں رکوع میں جو او ما ملکتم مفاتحہ آیا ہے۔ یہاں مفاتح کو مفتاح کی جمع قرار دے اس کے معنی کنجیاں لیتے ہیں۔ مفسرین نے چونکہ اس کو خلاف مفتاح کی جمع لکھدی ہے اس لئے اہل لغت جو مفسرین سے متاخر ہیں انھوں نے بھی اس کو مان لیا اور مفتاح کی جمع مفاتیح کے ساتھ مفاتح بھی لکھدی مگر اس کے سوا کوئی دوسری مثال ایسی نہیں پیش کی جا سکتی کہ مفعال کے وزن پر کوئی لفظ آیا ہو اور اس کی جمع مفاعل کے وزن پر آگئی ہو۔ مفسرین کا مقصد صرف اپنی مزعومہ تفسیر کو صحیح ثابت کرنا تھا۔ اہل لغت نے ان کی تائید کر کے ان کا ہاتھ مضبوط کر دیا۔ مگر عوام علمائے مقلدین ان کی بات مان لیں یہ اور بات ہے۔ اہل تحقیق ضرور ان سے یہ پوچھتے رہیں گے کہ وہ کوئی دوسرا لفظ ایسا دکھائیں جو مفعال کے وزن پر ہو اور اس کی جمع مفاعل کے وزن پر آئی ہو۔ یا کم سے کم اس ما فیہا النزاع آیت کے سوا کسی اور جگہ مفاتح کا لفظ دکھائیں جہاں صرف کنجیوں ہی کے معنی لئے جا سکتے ہوں۔ یہاں تو کنجیوں کے معنی زبردستی لئے جا رہے ہیں۔ ہر جگہ زبردستی نہیں چل سکتی اور جب کوئی دوسرا لفظ مفعال کے وزن والا ایسا نہیں مل سکتا جس کی جمع مفاعل کے وزن پر آئی ہو اور نہ کسی جگہ مفاتح کا لفظ اس طرح دکھایا جا سکتا ہے جہاں اس سے صرف کنجیاں ہی مراد ہوں تو یقیناً سورۂ نور کی مذکورہ آیت میں بھی مفاتح مَفتَحٌ ہی کی جمع ہے مفتاح کی جمع کہنا ہرگز صحیح نہیں۔ اور اہل لغت کی خلافِ

Marfat.com

قاعدہ بات جو محض مفسرین کی تقلید میں لکھی گئی ہے کبھی ماننے کے قابل نہیں۔ الفاظ کی تحقیق یا قاعدے کی روے کی جائے گی یا محاورے سے۔ خلاف قاعدہ و خلاف محاورہ کسی کی بھی بات میزان تحقیق میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

نحوی ترکیبوں کو تو نہ پوچھئے۔ کوفیوں اور بصریوں کے کتنے من گھڑت قواعد ہیں جن کے ماتحت قرآنی آیات میں طرح طرح کی معنوی تحریفوں کی کوشش کی گئی ہیں۔ مثلاً سورۂ یوسف میں ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ یعنی زلیخا حضرت یوسفؑ کی طرف مائل ہو گئیں اور یوسفؑ بھی ان کی طرف مائل ہو جاتے اگر وہ اپنے رب کی دلیل دیکھے ہوئے نہ ہوتے جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت زلیخا کی طرف حضرت یوسفؑ مائل نہیں ہوئے۔ مگر وہاں تو کوشش اس کی تھی کہ انبیاء علیہم السلام کے دامن تقوی کو بھی ابتلاعِ ہوا و ہوس سے آلودہ ثابت کریں۔ اسلئے علامت وقف کی جگہ بدل دی اور یوں بنا یا ولقد همت به وهم بها ط لولا ان رای برهان ربه[۱] یعنی زلیخا یوسفؑ کی طرف مائل ہو گئیں اور یوسفؑ زلیخا کی طرف مائل ہو گئے مگر یوسفؑ اگر اپنے رب کی دلیل دیکھے ہوئے نہ ہوتے تو ضرور فعل بد میں مبتلا ہو جاتے۔ یعنی لولا ان رای برهان ربه جو حرف شرط ہے اس کی جزا محذوف مانی جائے۔ یہ اس لئے کہ ان کے نزدیک لولا کی جزا پہلے نہیں آتی۔ معلوم نہیں یہ وحی ان نحویوں پر کس کی طرف سے ہوئی کہ لولا کی جزا مقدم نہیں آسکتی۔ قرآن ہی میں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ما یعبؤ بکم ربی لولا دعاؤکم۔ کہ جزائے مقدم ما یعبؤ بکم ربی یہاں موجود ہے (آخر سورۂ قاف) تعجب ہے کہ یہاں بھی ما یعبؤ بکم ربی کے بعد علامت وقف بنا کر لولا کی جزا بعد کو محذوف ماننے کی ترکیب کیوں نہیں نکالی گئی؟

اسی طرح سورۂ اعراف ع۵ میں ہے وما کنا لنھتدی لولا ان ھدنا اللہ۔ یہاں بھی چاہئے تھا کہ وما کنا لنھتدی کے بعد علامت وقف بنا دیتے اور لولا ان ھدنا اللہ کے لئے کوئی جزائے محذوف ٹھہرا لیتے اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں مگر یہ دو مثالیں کافی ہیں جن سے صاف طور سے ثابت ہو رہا ہے کہ لولا کی جزا بہایت اطمینان کے ساتھ مقدم آتی ہے اور جہاں اس کی جزا مقدم آتی ہے وہاں ایک طرح کا مفہوم حصر پیدا ہو جاتا ہے۔ غور کرنے سے اس کا پتہ مل سکتا ہے۔

دوسری مثال دیکھئے کہ سورۂ احزاب کے پانچویں رکوع میں فرمایا گیا ہے واذ تقول للذی انعم اللہ علیه وانعمت علیه امسك علیك زوجك واتق اللہ وتخفی فی نفسك ما اللہ مبدیه وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ ط جب تم کہہ رہے تھے اس شخص سے جس کو اللہ نے نعمت دی اور تم نے نعمت دی کہ اپنی بیوی کو تم اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو۔ اور تم ایسی بات کو اپنے جی میں چھپائے ہو جس کو اللہ ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔"

حضرت زینب بنت جحش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت امیمہ بنت عبد المطلب کی صاحبزادی تھیں ۔۔۔

---

[۱] پہلی عبارت کی نوعیت جو همت به پر وقف کرنے سے سجع کی خوبصورتی کی شکل میں پیدا ہو رہی ہے یعنی بہ کا قافیہ ربہ ہو رہا ہے۔ اس خوبصورتی کو بھی اس گمراہ کن اور بھونڈے وقف سے ان لوگوں نے ضائع کر دیا ۱۲ منہ غفرلہ

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت زید بن حارثہ سے بیاہ دیا تھا حضرت زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور پھر آپ نے ان کو اپنا متبنّٰی بھی بنا لیا تھا اسلئے لوگ ان کو زید بن محمد کہنے لگے تھے۔ مگر جب قرآن میں حکم آیا کہ اُدْعُوهُمْ لاٰبَاۗئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ. تم متبنّاؤں کو ان کے باپ ہی کی طرف منسوب کرکے پکارا کرو کہ یہی زیادہ انصاف کی بات ہے اللہ کے نزدیک۔ (سورۂ احزاب ع۱) تو اس حکم کے بعد سے لوگ ان کو زید بن حارثہ ہی کہنے لگے۔ یعنی ان کو ان کے باپ ہی کی طرف منسوب کرکے پکارنے لگے۔ مگر یہ واقعہ اس کے بعد کا ہے۔ یعنی جس واقعے کو ہم بیان کر رہے ہیں تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام آزاد کردہ کو اپنا متبنّٰی بنالیا اور اس نعمت تقرب و عزت بخشی سے ان کو رسول نے سرفراز کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسی صورت نکالدی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے اور آپ ہی کی خدمت میں برابر رہے اور ان مومنین میں سے ہوئے جو السابقون الاولون کے معزز لقب سے ممتاز ہوئے۔ پھر قریش کے معزز خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھیری بہن سے بیاہے گئے۔ غرض اللہ و رسولؐ کے ان پر خاص خاص احسانات تھے مگر حضرت زیدؓ نے اپنے نکاح کے کچھ دنوں کے بعد حضرت زینب کو طلاق دے دینے کا ارادہ کرلیا۔

ممکن ہے انھوں نے خود اپنے اس ارادے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی ہو، یا کسی اور سے اس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گئی ہو کہ زیدؓ، حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ نے خود ان کو بلا کر ان سے پوچھا ہو۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو سمجھایا اور ان سے چار باتیں ارشاد فرمائیں ۱۔ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو۔ ۲۔ وَاتَّقِ اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرو۔ ۳۔ وتخفی فی نفسك ما الله مبديه اور تم ایسی باتوں کو اپنے جی میں چھپاتے ہو جس کو اللہ ظاہر کردے گا۔ ۴۔ وتخشی الناس والله احق ان تخشٰه اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تم اس سے ڈرو۔

مگر غلامی کی وجہ سے انسان میں جو جذبہ مرعوبیت پیدا ہوجاتا ہے ان میں بھی پیدا ہوگیا تھا چنانچہ حضرت زینبؓ جب ان کے پاس بیاہ کر آئیں تو خود یہ کہتے ہیں کہ عظمت فی صدری حتی ما استطیع ان انظر الیها ان کی عظمت اس قدر میرے سینے میں محسوس ہوتی تھی کہ میں ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتا تھا (رواہ مسلم) یعنی جب تک حضرت زینب ان کے پاس رہیں ہاتھ لگانا تو بڑی بات تھی وہ ان کی طرف نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتے تھے اس قدر ان سے مرعوب تھے اور ان کی ہیبت ان پر طاری تھی۔ مگر اپنی اس کمزوری کو کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے اور ایک ایسی شخصیت کا اپنے ساتھ دن رات رکھنا جس کی اس قدر ہیبت ان پر طاری رہتی ہو اس کو بھی وہ گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ اسلئے بہتر یہی سمجھے کہ ان کو طلاق دے کر آزاد کردیں اور خود بھی اس مرعوبیت کی مصیبت سے نجات حاصل کرلیں۔ اس طرح اپنی کمزوری کا راز بھی چھپا رہے گا یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم اس بات کو ظاہر کردیں گے تو لوگ ہم پر ہنسیں گے اور ذلیل و حقیر سمجھیں گے۔ اور اگر طلاق نہ دیں گے تو پھر یہ راز چھپا نہ رہے گا کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کر رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو سمجھ کر ان سے فرمایا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے سے علیحدہ نہ کرو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو۔ یعنی بلا وجہ اللہ کی اس دی ہوئی نعمت کو اپنے سے الگ کرنا ناشکری ہے۔ بلا وجہ طلاق دینا بھی بری بات ہے ان دو باتوں کے بعد یہ بھی فرمادیا کہ تم جس بات کو اپنے جی میں چھپائے ہوئے ہو وہ چھپی نہیں رہنے کی۔ اللہ اس کو ظاہر کر دے گا۔ چنانچہ اللہ نے خود انھیں کی زبان سے بعد کو کہلوا دیا اور ان کی وہ کمزوری ظاہر ہو کر رہی۔ آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھی بات یہ کہی کہ تم لوگوں سے کیا ڈرتے ہو، اللہ سے ڈرو۔ وہ اس کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ پہلے بھی اتق اللہ کہکر اللہ سے ڈرایا تھا پھر یہ بتادیا کہ انسانوں کا ڈر ہی کیا ہے؟ ڈر تو اللہ ہی کا ہونا چاہیئے۔ غرض یہ چار باتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے کہی تھیں مفسرین نے کوفہ و بصرہ کی نحوی کج بحثوں کا سہارا لیکر کے منافقین کی جھوٹی روایت کو نادانستہ صحیح ثابت کرنے کیلیئے ان چاروں قولوں کا بٹوارہ کر دیا۔ یعنی لکھتے ہیں کہ پہلے دو قول تو بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو کہے لیکن بعد کے دو قول اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائے تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کو زبان سے تو کہہ رہے تھے أمسك عليك زوجك اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو۔ مگر آپ کے جی میں یہ تھا کہ زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دیدیں تو ان کی طلاق کے بعد ہم ان سے نکاح کرلیں۔ معاذ اللہ من ذالک۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دینے کیلیئے نہیں کہتے تھے کہ آپ ان کو متبنیٰ بنا چکے تھے اور اس وقت تک متبنیٰ کی حیثیت عرب کے رواج کے مطابق بالکل بیٹے ہی جیسی ہوتی تھی جس طرح بیٹے کی منکوحہ سے اس کی طلاق کے بعد بھی باپ نکاح نہیں کر سکتا۔ اسی طرح متبنیٰ کی منکوحہ سے بھی نکاح کا رواج نہ تھا تو آپ ان سے نکاح دستور کے مطابق کر بھی نہیں سکتے تھے اور خلاف دستور کر لیتے تو پبلک میں بڑی بدنامی ہوتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ تم چھپاتے ہو ایسی بات کو جس کو اللہ ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس بات کا کہ اس سے تم ڈرو۔ (معاذ اللہ من تلک الھفوات)

منافقین نے اس سلسلے میں طرح طرح کی روایتیں گھڑی ہیں جن کا ذکر کرنا بھی ہم گناہ سمجھتے ہیں اسلئے ایسی ناگفتہ بہ روایتوں کے ذکر سے ناظرین ہمیں معذور سمجھیں۔ مختصر یہ ہے کہ مفسرین کو ان چاروں باتوں کی تقسیم کا موقع نحوی موشگافیوں کی بدولت ملا۔ نحو کا ایک مشہور مسئلہ یہ ہے کہ جملہ خبریّہ وجملہ انشائیہ کے درمیان عطف جائز نہیں ہے۔ یہ اصولاً بالکل صحیح ہے ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر یہاں عطفِ جملہ بر جملہ ہے کہاں؟ یہاں تو عطف مقولہ بر مقولہ ہے۔ یہاں اس کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار قول حضرت زیدؓ سے کہے تھے۔ ان چاروں اقوال کو گن دیا گیا۔ وہ اقوال چاہے سب کے سب جملہ خبریہ ہوں یا سب جملہ انشائیہ۔ یا بعض خبریہ ہوں اور بعض انشائیہ۔ اسلئے ان چاروں جملوں کی حیثیت یہاں کلمات مفردہ کی ہے۔ ان کے مقولہ ہونے نے ان کو جملوں کی حیثیت ہی میں نہیں رکھا۔ اسلئے پہلے دونوں مقولے اگر جملہ خبریہ اور دوسرا جملہ انشائیہ اگر ہے تو ہوا کرے مقولہ ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ ان کے درمیان عطف بخوبی جائز ہے۔ جس طرح سورۂ یوسف کے آٹھویں رکوع ۱۳ میں وقال یبنیّ لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقۃ ط وما اغنی عنکم من اللہ من شیءٍ ط اس آیت میں

لاتدخلوا من باب واحد پہلا جملہ انشائیہ ہے پھر وادخلوا من ابواب متفرقۃ دوسرا جملہ انشائیہ ہے۔ دونوں معطوف علیہ و معطوف ہیں پھر وما اغنی عنکم من اللہ من شیٔ جملہ خبریہ ہے جس کا عطف پہلے دونوں جملہ انشائیہ پر کیا گیا ہے اور یہ جائز ہے اس لئے کہ تینوں جملے قال کے تحت میں ہیں یعنی تینوں جملے اس قال کے مقولے ہیں، اور ایک مقولے کا عطف دوسرے مقولے پر ہے نہ کہ ایک جملے کا عطف دوسرے جملے پر۔ اس طرح کی مثالیں متعدد مل سکتی ہیں اگر تھوڑی جستجو کی جائے۔

مگر مفسرین کو یہ خیال کرنا تھا کہ ان روایات مکذوبہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ اخلاقِ حسنہ پر کس قسم کا بدنما دھبہ لگ رہا ہے، پھر قرآن مجید میں تحریف ہو رہی ہے مگر ان باتوں کا کچھ خیال نہ کیا صرف روایت پرستی کے جذبے کے ماتحت آیات قرآنیہ کی معنوی تحریف تک کر گئے۔

غور کیجئے حضرت زینبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی پھوپھی کی صاحبزادی تھیں جن کو آپ نے بچپن سے دیکھا تھا اس لئے یہ روایت کہ حضرت زیدؓ سے نکاح کے بعد ایک بار آپ کی نظر ان پر پڑ گئی تو آپ نے یہ خیال فرمایا کہ اگر زید ان کو طلاق دیدیں تو میں ان سے نکاح کر لوں گا کس قدر خلاف عقل ہے جس عورت کو آپ نے سینکڑوں بار دیکھا ہوگا اس کے بچپن سے جوانی تک بلکہ حضرت زیدؓ سے نکاح کے بعد تک، اسلئے کہ اس وقت تک عورتوں کے لئے پردے کا حکم[1] نہیں آیا تھا اور وہ تو اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی تھیں۔ اگر آپ کی خود خواہش ہوتی تو حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح ہی کیوں کر دیتے؟

دوسری بات یہ کہ اس وقت تک متبنیٰ کی بیوی کی بالکل وہی حیثیت تھی جو حیثیت بیٹے کی بیوی کی ہو سکتی ہے۔ آپ نے بالاعلان اپنی نبوت سے پہلے ہی ان کو متبنیٰ بنا لیا تھا اور سب لوگوں کو اس سے مطلع کر دیا تھا۔ اسلئے آپ کا یہ ارادہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اگر زیدؓ ان کو طلاق دیدیں تو میں ان سے نکاح کر لوں جس سے نکاح حسب دستور خاندان حرام ہو۔ اور ابھی تک آپ کے نزدیک ایسا حرام ہی کہ اس سے نکاح کی خواہش آپ کو کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ حکم کہ متبنیٰ بیٹا نہیں ہو جاتا اس کو اس کے باپ ہی کی طرف منسوب کر کے پکارا کرو، یہ اس واقعے کے بعد نازل ہوا ہے۔ یہاں تو حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دینے سے منع فرما رہے تھے اس کے بعد جب وہ طلاق دے چکے تو اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت زینبؓ کا نکاح کر دیا جیسا کہ سورہ احزاب میں یہیں پر ہے فزوجناکھا یعنی ہم نے تمہیں زینب سے بیاہ دیا۔ اور اسی کے بعد فرمایا گیا کہ لکیلا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیاءھم اذا قضوا منھن وطرا۔ ہم نے اے رسول! تم سے اس (زینبؓ) کو بیاہ دیا، تاکہ اپنے منہ بولے متبناؤں کی بیویوں کے متعلق جب کہ وہ ان کو طلاق دیدیں تو مسلمانوں کو کوئی مضائقہ محسوس نہ ہو۔

---

[1] پردہ کا حکم عام عورتوں سے پہلے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کیلئے آیا تھا اور یہ حکم غزوۂ حنین کے بعد آیا اور غزوۂ حنین سنہ ۸ھ کے شوال میں ہوا تھا اور حضرت زینبؓ حضرت زیدؓ سے طلاق پانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئی ہیں سنہ ۵ھ میں حکم حجاب سے تین برس قبل۔ دیکھئے تاریخ ابن جریر طبری ج ۳ ص ۴۹، ۱۲۔ منہ

Marfat.com

اور اسی سورۂ احزاب کے شروع میں ہے وما جعل ادعیاءکم ابناءکم ذلکم قولکم بافواھکم۔ اسنے تمہارے منہ بولوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنادیا ہے۔ یہ تمہاری باتیں ہیں جو اپنے منہ سے تم بول گئے ہو۔ اس کے بعد یہ بھی فرمادیا کہ ادعوھم لاٰبائھم ھوا اقسط عند اللہ ان کو ان کے باپ ہی کی طرف منسوب کرکے پکارا کرو۔ یہی زیادہ انصاف کی بات ہے اللہ کے نزدیک۔ یہ اگرچہ ابتدائے سورۂ احزاب میں ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت زیدؓ نے جو حضرت زینب کو طلاق دی تھی اس سے پہلے یہ سورہ اترا تھا۔ آنحضرت سے حضرت زینب کا نکاح ۵ھ کے اوائل کا واقعہ ہے اور جنگ احزاب ماہ شوال ۵ھ میں ہوئی تھی اور سورۂ احزاب کا نزول جنگ احزاب کے بعد ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ منافقین و ملاحدہ کی من گھڑت روایتوں کو محض روایت پرستی کے جذبے کے ماتحت مفسرین نے لکھ لیا اور اس کو مطلق خیال نہ کیا کہ ان روایتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ پر کس حد تک حرف آتا ہے۔ بعضوں نے بعض کچھ زائد روایتوں کو چھوڑدیا، یا کچھ تاویلیں کرکے الزام کو ہلکا کیا مگر یہ نہ سمجھے کہ ہمارا کسی حد تک بھی ان روایتوں کو قبول کرلینا منافقین کے منشا کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔ اور جن روایتوں کو ہم نے چھوڑ دیا ہے کتنے محدثین نے ان کو بھی اپنی کتابوں میں لکھ لیا ہے۔ اسلئے ہم نے جو کچھ لکھ دیا اس کے دیکھنے کے بعد وہ روایتیں بھی جن کو ہم نے چھوڑ دیا ہے جن کی نظروں سے گذریں گی، کیا وہ ان سب کو ملا کر جب دیکھیں گے تو گھبرا نہ جائیں گے؟ اور مخالفین کے لئے سامان طعن و تشنیع ہم مہیا نہیں کررہے ہیں؟

(۷) محاذ فصاحت و بلاغت

مفسرین نے اختلاف قرأت کا بہت ذکر کیا ہے اور جتنے لفظی اختلافات منافقین عجم نے قرآنی آیتوں میں پیدا کئے ہیں ان میں سے اکثروں کا ذکر مفسرین نے کیا ہے اور اس طرح ان منافقین کے مذموم مقاصد کی تکمیل نادانستہ ہی سہی مفسرین کے ذریعہ ہوتی رہی ہے اور کیوں نہ ہوتی؟ اگلے مفسرین میں بھی تو بعض لوگ اس جماعت کے تیار کردہ تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ راویان روایات تفسیر میں ایک بڑی جماعت انھیں لوگوں کی تھی جن میں سے بعض اکابر کے مختصر حالات محاذ تفسیر میں انشاء اللہ ذکر کئے جائیں گے۔

ان اختلاف قرأت کا ذکر بعض فقہی مسائل کے سلسلے میں تو آتا ہی ہے۔ صرفی و نحوی بحثوں کے ضمن میں بھی ان کا ذکر آجاتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ مغالطہ آمیز و وسوسہ انگیز وہ اختلاف قرأت ہے جو فصاحت و بلاغت کے ماتحت ہو یعنی قرارت متواترہ کے سوا جو دوسری قرائتیں منافقین و ملاحدہ کی ساختہ و پرداختہ ہیں، ان میں سے کسی قرارت کے متعلق کسی ماہر فن بلاغت نے لکھدیا ہو کہ یہ قرارت متواترہ سے ابلغ ہے۔ مثلاً فاللہ خیر حفظاً وھو ارحم الرّاحمین (یوسف ع۸) کی ایک قرارت حفظاً کی بھی بتائی گئی ہے جس کا ذکر تقریباً اکثر مفسرین نے کیا ہے۔ علامہ ابوالفتح عثمان بن جنی متوفی ۳۹۳ھ نے اپنی اَمالی میں حفظاً ہی کی قرارت کو یہاں ابلغ قرار دیا ہے، اور اس کا قیاس زیدٌ عدلٌ پر کیا ہے۔

علامہ ابن جنی کی کوئی تفسیر تو متعارف نہیں ہے مگر وہ فن بلاغت کے امام ضرور سمجھے جاتے ہیں، اس لئے ان کا لکھدینا سند سمجھا جاتا جو لوگ اختلاف قرأت پر ایمان رکھتے ہیں ان کو کیا ہے کوئی قرارت شاذہ بھی قرارت متواترہ سے زیادہ بلیغ ہوئی تو وہ کہدیں گے کہ گنجائش

مِنْ عِنْدِ اللہ۔ سب تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اگر ایک قرأت میں دوسری قرأت سے زیادہ بلاغت ہوئی تو کیا حرج ہے مگر جو صرف قرأت متواترہ ہی کو منزل من اللہ سمجھتا ہے اور دوسری سب قرأتوں کو منافقین کا افترا و بہتان یقین کرتا ہے وہ کس طرح کسی دوسری قرأت کو قرأتِ متواترہ سے زیادہ بلیغ مان سکتا ہے؟

بات یہ ہے کہ علامہ ابن جنی بہت بڑے ادیب تھے، فن بلاغت کے امام تھے مگر منطق نہیں جانتے تھے، اس لئے قیاس مع الفارق[1] سے مغالطے میں پڑ گئے۔ اول تو یہی کوئی ضروری نہیں ہے کہ جہاں مبالغے کا مفہوم پیدا کیا جائے وہاں بلاغت بھی پیدا ہو جائے۔ مبالغہ اور بلاغت کا مادہ ایک ضرور ہے مگر دونوں کے مفہوموں میں کوئی مناسبت یا ملازمت باہمی نہیں۔ بلیغ تو وہ کلام ہے جو مقتضائے حال کے مطابق ہو فصاحت کے ساتھ۔ ہو سکتا ہے کہ بے ضرورت و بے محل مبالغہ کلام کو غیر بلیغ بنادے۔ اسلئے "زیدٌ عدلٌ" میں مبالغہ کا مفہوم تو ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ مگر بلاغت کا مفہوم بھی ہو یہ کوئی ضروری نہیں۔ اگر ایسے موقع پر کہا گیا ہے جو بالکل حسب حال مقتضائے محل کے مطابق پڑا تو ضرور یہ بلیغ ہے اور ابلغ بھی ہو سکتا ہے ورنہ اگر مقتضائے حال کے خلاف کہنے والے نے کہا ہے تو بھی جملہ کچھ بھی بلیغ نہیں ابلغ کیا ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ عَدْلٌ مصدر کا صیغہ ہے اور مصادر کا "حمل بالمواطاۃ"[2] کسی ذات پر جائز نہیں۔ یعنی کوئی صیغہ مصدر اپنے معنی مصدری میں کسی مبتدا کی خبر نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی مصدر کا حمل کسی ذات پر کہیں کیا گیا ہو تو ایسی جگہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ مصدر اپنے معنی مصدری میں ہرگز نہیں ہے بلکہ معنی وصفی کو متضمن ہو کر کسی صیغہ صفت ہی کے معنی میں آیا ہوگا۔ یا حاصل مصدر یا اسم مصدر کے معنی میں ہوگا۔

"میر زاہد ملا جلال" کے شروع ہی میں للمصدر ستۃ معانٍ کی بحث مشہور ہے (یعنی مصدر کے چھ معنی ہیں) ان چھ معنوں میں سے اسم فاعل ہی کے معنی یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں۔ یعنی "زیدٌ عدلٌ" کو "زیدٌ عادلٌ" کے معنی میں سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ "مجاز فی الطرف" ہے جس میں کوئی خاص شانِ بلاغت نہیں کیونکہ معنی فاعلی کے لئے اسم فاعل کا صیغہ تو موجود ہی ہے۔ جب وہی معنی لینا ہیں تو پھر مصدر کو اسم فاعل کے معنی میں مستعار لینے کی کیا ضرورت ہے۔ باقی پانچ معنوں میں سے معنی مصدری معروف، مجہول، اسم مصدر اور حاصل مصدر مجہول کے چار معنی بھی یہاں کوئی معنوی مناسبت نہیں رکھتے۔ اس لئے ان میں سے بھی یہاں کوئی معنی مراد نہیں لئے جا سکتے"

---

[1] ایک چیز کو انسان دوسری چیز پر قیاس کرتا ہے پہلی چیز کو مقیس دوسری چیز کو مقیس علیہ کہتے ہیں۔ دونوں میں مشابہت کا ہونا ضروری ہے جب تک دونوں کے درمیان صحیح مشابہت نہ ہو قیاس صحیح نہیں ہو سکتا۔ جس بات میں مشابہت ہو اس میں دونوں کے درمیان کوئی ایسا فرق بھی ہو جس کی وجہ سے قیاس غلط ہو جائے۔ اگر دونوں میں فرق ہو تو اسی کو "قیاس مع الفارق" کہتے ہیں جو صحیح نہیں ہوتا۔ ۱۲ منہ غفرلہ

[2] علم منطق کی اصطلاح میں کسی لفظ کو خبر قرار دیکر اس کی نسبت کسی مبتدا کی طرف کرنے کو "حمل" کہتے ہیں۔ اسی لئے "خبر" کو "محمول" اور "مبتدا" کو "موضوع" کہتے ہیں۔ "حمل" کی دو قسمیں ہیں: (۱) "حمل بالمواطاۃ" یعنی کسی لفظ کی نسبت جس طرح وہ ہے بعینہ اسی طرح کسی موضوع کی طرف کی جائے اور وہ محمول کسی مصدر کا مشتق نہ ہو۔ جیسے "انسان" کی نسبت "زید" کی طرف کی جائے اور کہیں کہ "زیدٌ انسانٌ"۔ (۲) "حمل بالاشتقاق" یعنی اس لفظ کی نسبت کسی موضوع کی طرف بعینہ نہ ہو سکے جب تک اس کا کوئی صیغہ مشتق نہ بنالیں۔ جیسے "عقل" کی نسبت "زید" کی طرف نہیں ہو سکتی جب تک "عقل" کو اسم فاعل نہ بنالیں تو "عاقل" کی نسبت زید کی طرف کرینگے کہ "زیدٌ عاقلٌ" یا کوئی دوسرا لفظ "عقل" پر بڑھا کر کہیں کہ "زیدٌ صاحبُ عقلٍ" یا "ذو عقلٍ"۔ "صاحب عقل" اور "ذو عقل" بھی "عاقل" ہی کے معنی میں ہیں، اسلئے "عقل" کے مشتق ہی ٹھہرے ۱۲ منہ غفرلہ۔

Marfat.com

رہ گیا حاصل مصدر معروف۔ تو مجازاً یہاں اس کے معنی ضرور لیے جا سکتے ہیں اور اس کو "مجاز فی النسبۃ" کہتے ہیں تو اگر عدل کو بمعنی حاصل مصدر ایک اسم صریح قرار دے کر زید کی طرف منسوب کیا گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زید ہمہ تن سراپا عدل ہے، مجسم عدل ہی۔ اسی اعتبار سے اس میں مبالغے کا مفہوم پیدا ہوا اور اگر مقتضائے حال کے مطابق کہا گیا ہے تو یہ ابلغ بھی ہے۔

صحیح اصول یہ ہے کہ مسند الیہ کی نوعیت کے مطابق حمل کی نوعیت ہوگی۔ مسند الیہ خود اگر کوئی مفہوم مصدری ہے تو اس کی طرف کسی دوسرے مفہوم مصدری کی اسناد بخوبی کی جا سکتی ہے۔ جیسے ان الشرك لظلم عظیم "شرک" ایک مصدر ہے جو معنی مصدر کا ہی میں آیا ہے اور "ظلم" بھی مصدر ہی ہے اور اس کے معنی مصدری ہی کا حمل "شرک" پر کیا گیا ہے۔

اور مسند الیہ اگر مفہوم مصدری کے سوا کوئی دوسرا مفہوم یا کوئی دوسری چیز ہو اور محمول مصدر کا صیغہ ہو تو اس مصدر سے معنی مصدری کے سوا باقی پانچ معنوں میں سے کوئی معنی جو مناسب مقام نظر آئیں لیے جائیں گے جیسے هذا تاویل رویای۔ تاویل مصدر ہے مگر یہاں حاصل مصدر مجہول کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی هذا ما اول به رویای اور انه لقول فصل میں قول مصدر ہے لیکن اسم مفعول یعنی مقول کے معنی میں آیا ہے۔ اور فصل بھی مصدر ہی ہے مگر اسم فاعل یعنی فاصل (بین الحق والباطل) کے معنی میں آیا ہے۔

اور جب مسند الیہ کوئی شخص کوئی ذات ہو اور کسی مصدر کا حمل اس پر بالمواطاۃ ہوا ہو تو وہ اسم فاعل یا اسم مفعول کے معنی میں مجاز فی الطرف کی رو سے ہوگا۔ یا کسی ایسے معنی میں ہوگا جو معنی فاعلی و مفعولی سے قریب ہو، اور مفہوم وصفی کو متضمن ہو۔ جیسے فرمایا گیا ہے وانه لعلم للساعة وہ قیامت کی ایک علامت ہے۔ علم مصدر ہے مگر یہاں اسم آلہ کے مفہوم میں آیا ہے یعنی جس طرح خاتم کو اسم آلہ کہتے ہیں کہ ما یختم به الصانع کے معنی میں ہے اسی طرح یہاں علم بمعنی علامت ہے ما یعلم به الشیئ کے معنی میں۔ (یہ معنی میرزاہد والے چھ معنوں کے علاوہ ہیں ساتویں معنی۔ مگر وہ چھ قیاسی معانی ہیں اور یہ سماعی۔ اسی لئے اس کا ذکر میرزاہد نے نہیں کیا) مگر درحقیقت یہاں علم بمعنی حاصل مصدر مجہول ہے اسی لئے ما تعلم به الساعة کے معنی میں ہے جس کو بمعنی اسم آلہ کہا گیا۔ اسلئے یہ بھی ان چھ معنوں میں داخل ہے۔

غرض مصدر کا حمل کسی ذات پر بالمواطاۃ ہو تو وہ مجازاً ہی ہوگا۔ معنی مصدری میں نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی صیغہ صفت کے معنی میں ہو تو مجاز فی الطرف ہے اور اگر حاصل مصدر کے معنی میں ہو تو چونکہ حاصل مصدر کی حیثیت ایک اسم صریح کی سی ہوتی ہے اسی لئے وہ مجاز فی النسبۃ کہا جائے گا جس کو مجاز فی الاسناد، مجاز عقلی اور مجاز حکمی بھی کہتے ہیں۔ اور مجاز فی الاسناد مجاز فی الطرف سے ابلغ ہے۔ اگرچہ یہاں بھی مفہوم کسی صیغہ صفت ہی کا پیدا ہوتا ہے کیونکہ جب تک محمول میں وصفی حیثیت نہ ہو اس وقت تک اس کا حمل کسی ذات پر نہیں ہو سکتا۔

اتنی تفصیل کے بعد "زید عدل" پر غور کیجئے کیونکہ الله خیر حفظا کو اسی پر قیاس کیا گیا ہے اور اسی قیاس مع الفارق پر علامہ ابن جنی کی غلط فہمی کی بنیاد ہے تو اس مبہم کو سر کرنے کیلئے ذیل کے نمبروں پر نگاہ غور ڈالیے۔

Marfat.com

(۱) مصدر کا حمل بالمواطاۃ کسی ذات کسی شخص پر جائز نہیں۔

(۲) اگر کسی مصدر کا حمل بالمواطاۃ کسی ذات پر کیا گیا ہو تو وہ مصدر کسی صیغۂ صفت ہی کے مفہوم میں یا اسم صریح کے معنی میں ہوگا۔

(۳) "زید عدلٌ" میں "عدلٌ" مصدر ہے اور یہاں مفہوم فاعلی کے سوا کسی اور مفہوم میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ چاہے وہ مفہوم فاعلی جس طرح بھی ادا ہو۔

(۴) اگر "زیدٌ عدلٌ" میں "عدل" اسم فاعل یعنی عادل ہی کے معنی میں ہے تو پھر "عادلٌ" کے متعارف لفظ کو چھوڑ کر جو معنی فاعلی ہی کے لئے وضع کیا گیا ہے، خواہ مخواہ صیغۂ مصدر کو مستعار لینے کا کیا فائدہ؟ خصوصاً جب اپنی خاص چیز سے کچھ زیادہ خوبی شئی مستعار میں نہ ہو۔

؎ کہن جامۂ خویش پیراستن	بہ از جامۂ عاریت خواستن

ان چار نمبروں پر غور کر لینے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ "عادلٌ" کے لفظ سے عدول کر کے "عدلٌ" کا لفظ "عادل" ہی کے معنی میں نہیں لایا گیا ہے بلکہ یہاں "عدل" بمعنی حاصل مصدر معروف بطور اسم صریح آیا ہے اور "زیدٌ عدلٌ" سے مراد یہ ہے کہ زید مجسم عدل ہے، ہمہ تن عدل ہے، سراپا عدل ہے۔ اور اسی حیثیت سے اس میں مبالغہ بھی پیدا ہوا اور یہ ابلغ بھی ہے۔

اب اللہ خیر حفظاً پر غور فرمایئے۔ لیکن "زیدٌ عدلٌ" کی مذکورہ بالا بحث کو پیش نظر رکھ کر۔

سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ عَدْلٌ کا حمل ہے زید پر اور یہاں اللہ پر حفظ کا حمل ہی نہیں ہے اسلئے "زید عدلٌ" پر اللہ خیر حفظاً کا قیاس ہی صحیح نہیں۔ یہاں خیر کا حمل ہے جس میں خود وصفی مفہوم سوا اضافۂ مفہوم افضلیت موجود ہے، اگرچہ یہ شرٌ کے مقابلے میں ایک اسم صریح ہے اس لئے یہاں اس کا حمل بالمواطاۃ صحیح ہے۔ حافظاً یا حفظاً یہاں اس کی تمیز ہے اور تمیز مصدر بمعنی مصدری، معروف ومجہول، وبمعنی حاصل مصدر معروف ومجہول وبمعنی اسم فاعل واسم مفعول سب آسکتے ہیں اور بذات خود اسم فاعل واسم مفعول، وغیرہ بھی تمیز بن کر آسکتے ہیں۔ یہاں خیر کے لفظ سے مبالغے کا مفہوم پیدا ہی ہو رہا ہے اس کے لئے مصدر کو تمیز بنانے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ وہ چار وجوہ یہاں پائے جاتے ہیں جو عدل کے حمل میں پائے جاتے تھے۔ غرض جن وجوہ کی بنا پر "زید عدلٌ" میں باعتبار "زید عادلٌ" کے ابلغیت آئی ہے ان میں سے کوئی وجہ بھی اللہ خیرٌ حفظاً میں نہیں پائی جاتی۔ اس لئے اللہ خیر حفظاً کا قیاس "زید عدل" پر کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

تمیز کی بحث تمیز مصدر بھی آسکتا ہے، حاصل مصدر بھی، اسم فاعل بھی، اسم مفعول بھی اور اسم صریح بھی۔ اور اپنے اپنے موقع پر ہر چیز ابلغ ہو سکتی ہے۔ اگر تمیز کا حمل غیر ذوی العقول بلکہ غیر ذی روح پر ہو تو تمیز مصدر یا حاصل مصدر بخوبی آسکتی ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے جیسے احسن تفسیراً اور احسن تاویلاً وغیرہ۔ اور اگر تمیز کا حمل ذوی العقول پر ہو تو حاصل مصدر یا اسم صریح یا کوئی صیغہ صفت زیادہ مناسب ہے جیسے احسن عملاً اور احسن املاً[1] کہ یہاں عمل و امل بمعنی حاصل مصدر ہیں "کام" اور "امید" کے معنی میں اور بطور اسم صریح آئے ہیں اسی طرح اصدق قیلاً اور احسن قولاً میں قیل و قول مصدری معنی میں نہیں ہیں بلکہ بمعنی سخن وکلام ہیں۔

---

[1] یہاں اسم مفعول کے معنی بھی لئے جا سکتے ہیں یعنی خیر ماموَلاً۔ یعنی ما یومل بہ ۱۲ منہ غفرلہ

Marfat.com

یہاں کون ابلغ ہے؟

یہ تو معلوم ہوگیا کہ اللہ خیر حفظاً کا قیاس "زیدٌ عدلٌ" پر کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تمیز مصدر بھی آسکتی ہے اور اسم فاعل وغیرہ بھی تو جب حِفظاً بھی صحیح وفصیح ہے اور حافظاً بھی تو یہاں مقتضائے حال کے مطابق کون سی ترکیب ہے؟ یہاں تو معنی حقیقی مراد ہیں۔ یہاں تو اسناد مجازی نہیں ہے کہ مجاز فی الطرف اور مجاز فی النسبتہ کا فرق پیدا کر کے حاصل مصدر کے حمل کو فاعل کے حمل سے ابلغ کہا جائے۔ یہاں تو ممیز وتمیز کی ترکیب ہے، حمل ہی سرے سے نہیں ہے۔

کلام بلیغ کی تعریف تو یہی ہے کہ مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ مناسب مقام ومحل ہو تو دیکھئے کہ یہ محل حافظاً کا ہے یا حِفظاً کا؟ مقتضائے حال معلوم کرنے کے لئے سیاق وسباق دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ قول حضرت یعقوب علیہ السلام کا نقل کیا گیا ہے۔ تو دیکھئے کہ حضرت یعقوبؑ نے حافظاً کہا ہوگا یا حِفظاً؟ سیاق کلام کیا کہتا ہے؟

حضرت یعقوبؑ کے پاس ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ کے پاس سے آتے ہیں اور اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لیجانے کی اجازت باپ سے مانگتے ہیں اور چھوٹے بھائی کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں کہتے ہیں۔ وانا لہ لحٰفظون۔ ہم لوگ اس کے حافظ ونگہبان رہیں گے۔ اسی کے جواب میں حضرت یعقوبؑ نے ان بیٹوں سے کہا کہ کیا ہم اس کے متعلق بھی تم پر بھروسا کریں جس طرح اس کے بھائی کے متعلق تم پر بھروسا کیا تھا؟ (کیا تم اس کے حافظ ہوگے) فاللہ خیر حِفظاً وھو ارحم الراحمین۔ پس اللہ بہتر حافظ ونگہبان ہے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ اس سیاق عبارت کو دیکھئے ان لوگوں نے انا لہ لحافظون کہا تھا۔ اس کے جواب میں سیاق عبارت کا تقاضا یہی ہے کہ یہاں خیر حافظاً ہی ہو۔ اسی لئے دو قرائتیں اور بھی گھڑی گئی تھیں خیرُ حافظٍ کی مگر اس کی رکاکت واضح تھی اسی لئے یہ چلی نہیں۔ تو خیر الحافظین کی قرات بنائی گئی خیر الراحمین اور خیر الغافرین کے وزن پر۔ مگر یہاں اس کا بھی محل نہیں۔ اسلئے کہ اگر خیر الحافظین کہتے تو ان لوگوں کے حافظ ہونے کا انکار ثابت نہ ہوتا بلکہ ان کے حافظ ہوتے ہوئے اللہ کے بہتر حافظ ہونے کا بیان ہوتا اور یہاں تو پہلے ان پر الزام دیا ہے اور ان کو پہلے تجربے کی بنا پر ناقابل اعتماد قرار دیا ہے اس لئے یہ مقام یہ کہنے کا ہے کہ صرف اللہ بہتر حافظ ہے۔ حافظین، جو حفاظت کا وعدہ کر رہے تھے ان کے حافظ ہونے سے انکار بھی مقصود ہے اور یہ بات خیر حافظاً ہی سے نکل سکتی ہے۔ تو جو بات سیاق وسباق عبارت کے خلاف ہو وہ تو بلیغ بھی نہیں ہوسکتی ابلغ کیا ہوگی۔ بلیغ وابلغ وہی قول ہوسکتا ہے جو سیاق وسباق کے مطابق اور مقتضائے حال کے موافق ہو اور وہ یہاں خیر حافظاً ہی ہے۔

مصدر سے صدور فعل کا امکان ہی ثابت ہوگا۔ حفظ بمعنی حافظیت سے اتنا ہی ثابت ہوگا کہ حفاظت کرنے میں یا حافظ ہونے کی حیثیت سے وہی بہتر ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس پر اس مصدر کا حمل ہو اس سے صدور فعل ہو بھی جائے۔ مجھ کو یاد آتا ہے کہ میر زاہد ملا جلال میں اس مضمون کو بھی واضح کیا ہے کہ فاعل کے لئے صدور فعل زمانہ ماضی میں معنی حقیقی کے اعتبار سے ضروری ہے۔ اگر صرف آئندہ صدور فعل کی امید پر کسی کو فاعل قرار دیا جائے تو یہ مجازاً ہوگا حقیقتہً نہ ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ معنی حقیقی میں جو قوت ہے وہ معنی مجازی کو کہاں نصیب؟ اسی لئے خیر حفظاً میں حفاظت بالفعل کا مفہوم ضروری نہیں۔ حفاظت بالقوۃ کے اعتبار سے بھی خیر

Marfat.com

کہا جاسکتا ہے۔ مگر فاعل میں چونکہ معنی حقیقی کے اعتبار سے صدور فعل بزمانۂ ماضی ضروری ہے اس لئے خیر حافظاً سے معنی مراد ہوں گے کہ فی کل زمان یعنی ہر زمانے میں۔ زمانۂ ماضی میں صدور حفظ تو "حافظ" کے معنی حقیقی کے اعتبار سے ضروری ہی ہے۔ زمانۂ مستقبل کے لئے کہا ہی جارہا ہے۔ درمیان میں زمانۂ حال کیوں مستثنی رہے گا؟ غرض بہر حال خیر حافظاً ہی کی قرارت دوسری تمام قراتوں سے ابلغ ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ حفظاً کی قرارت رسم خط کے مطابق ہے اور حافظاً کی قرارت رسم خط کے مطابق نہیں کیونکہ حائے حطی کے بعد الف لکھا ہوا نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ حائے حطی کو کھڑا زبر دے کر حافظاً کیوں پڑھا جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا وہی کہے گا جو نہ قرآن کی رسم خط سے واقف ہے نہ سیاق و سباق کو دیکھتا ہے۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ یہ جواب ہے وانا لہ لحفظون کا۔ وہاں بھی حائے حطی کے بعد الف نہیں ہے بلکہ حائے حطی کو کھڑا زبر ہی دے کر حافظون ہر شخص پڑھتا ہے کسی نے بھی وہاں حفظون نہیں پڑھا ہے۔ تو جس طرح کھڑے زبر ہی کے ذریعے بغیر الف کے حٰفظون کو حافظون پڑھا ہے اسی طرح یہاں بھی کھڑے زبر ہی کے ذریعے بغیر الف کے حفظا کو حافظا پڑھنا ہوگا۔ تاکہ سوال و جواب یکساں رہے۔ آخر الرحمین کی رائے مہملہ کو تو ہیں پہ کھڑے زبر ہی کے ذریعے راحمین پڑھتے ہیں۔ یہ تو قرآن کی عام رسم خط ہے۔ بسم اللہ میں بھی الرحمٰن میں رب العلمین کے العلمین میں کھڑا زبر ہی الف کا کام دے رہا ہے۔

البتہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ تو پھر خلاف سیاق و سباق یہ قرارت کیوں بنائی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی صحیح و متواتر قرارت کے سوا دوسری قراتوں کے گھڑنے کی غرض تو یہ تھی کہ یہ دکھایا جائے کہ قرآن میں اختلافات بہت ہیں اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔ اگر یہ قرآن (اللہ کی طرف سے اترا ہوا نہ ہوتا) کسی غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے (نساء ۸۲) اس دعوے کو غلط ثابت کر دکھایا جائے۔ چنانچہ معنوی اختلافات کثیرہ کے لئے مختلف و متضاد تفسیری روایتیں بنا ڈالیں کہ ایک ایک آیت دس دس متبائن و متضاد معانی پیدا کرے اور لفظی اختلافات دکھانے کے لئے اختلاف قرارت کا ایک انبار لگا دیا۔

دوسری غرض یہ بھی تھی کہ معلوم ہو کہ لوگوں کو قرآن یاد نہ تھا۔ بغیر زیر زبر اور بلا نقطوں کے مصاحف کو دیکھ کر جس نے جیسا سمجھا ویسا پڑھا اور پھر جب حرکات وغیرہ سے الفاظ بدل گئے تو کچھ نہ کچھ معانی کا فرق بھی ضرور نکل آئے گا اور بعض جگہ افترائی مفہوم بھی نکالے جاسکیں گے جیسا کہ یہاں حفظاً کی قرارت گھڑ کر ایک نہایت خبیث مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ حفظاً یہاں یا اسم فاعل کے معنی میں آسکتا ہے اگر مصدر معروف یا حاصل مصدر معروف کے معنی میں بھی لیا گیا، جب بھی کہا جائے کہ اس وقت بھی وہی فاعل ہی کا مفہوم رہا کیونکہ مصدر معروف و حاصل مصدر معروف کی نسبت فاعل ہی کی طرف ہوتی ہے۔ یا یہاں حفظاً اسم مفعول کے معنی میں آسکتا ہے۔ اگر مصدر مجہول یا حاصل مصدر مجہول کے معنی میں لیا گیا۔ جب بھی اسم مفعول ہی کا مفہوم رہے گا۔ کیونکہ مصدر مجہول و حاصل مصدر مجہول کی نسبت در اصل مفعول ہی کی طرف ہوا کرتی ہے۔ غرض دو ہی صورتیں ہیں یہاں حفظاً کو

حافظاً کے معنی میں لیجئے یا محفوظاً کے معنی میں۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حافظ ہونے کی حیثیت سے زیادہ بہتر ہے یا محفوظ ہونے کی حیثیت سے؟ اللہ تعالیٰ کا محفوظ ہونا تو سب کے نزدیک ہر طرح مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فنا نہیں کر سکتا، قتل نہیں کر سکتا اس کو موت نہیں آسکتی، وہ بیمار نہیں پڑ سکتا، اور اس کو کسی طرح کا کوئی صدمہ کوئی رنج والم، کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے اس کا ہر طرح محفوظ ہونا مسلم ہے۔ تو اگر خیرٌ حفظاً کے معنی خیر محفوظاً لیجئے تو بالکل صحیح ہے، اس میں کسی کو کسی شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں، مگر خیرٌ حفظاً کے معنی اگر خیر حافظاً لیجئے تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ واقعے کے کہاں تک مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے وعدہ کیا کہ واللہ یعصمک من الناس۔ اللہ تجھ کو لوگوں (کے حملوں سے) محفوظ رکھے گا (مائدہ ۱۰) باوجود اس وعدے کے جنگ احد میں رسول اللہ صلعم کافی زخمی ہو کر گر گئے۔ یہاں تک کہ آپ کی وفات کی افواہ پھیل گئی۔ بس صرف اتنی حفاظت کی گئی کہ آپ کی جان بچ گئی، شہید نہ ہوئے۔ تو یہ پوری حفاظت بھی نہ ہوتی، بہتر حفاظت کیا کہی جاسکتی ہے۔ بہتر حافظ کی تو بہتر حفاظت ہونی چاہئے تھی۔

اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا مگر قرآن کی کتنی آیتیں ایسی تھیں جو بعض شہدائے جنگ یمامہ ہی کو یاد تھیں نہ کسی دوسرے کو یاد تھیں نہ کسی کے پاس لکھی ہوئی تھیں، وہ شہید ہو گئے تو ان کے ساتھ وہ آیتیں بھی شہید ہو گئیں۔ جواب کسی طرح بھی نہیں مل سکتیں۔ بعض آیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ پہلے اتری تھیں جو پتوں پر لکھ لی گئیں جن کو بکری کھا گئی۔ پھر خدا جانے کتنی آیتیں الٹ پلٹ ہو گئیں، کتنے الفاظ کم وبیش ہو گئے، کتنی حرکتیں بدل گئیں۔ تو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی گئی تھی اسی طرح قرآن کی بھی حفاظت کی گئی۔ بس اسی قدر کہ قرآن کا ایک بڑا حصہ محفوظ ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ زخموں سے، دندان مبارک کی شہادت سے اور چوٹ کی تکلیف سے محفوظ نہ رہے، اسی طرح قرآن بھی بعض حصوں کے ضائع ہو جانے سے محفوظ نہ رہا۔ وعدۂ حفاظت جس طرح ایک حد تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پورا اترا اسی طرح قرآن کے ساتھ بھی ایک حد تک پورا اترا۔ مگر اس سے اللہ تعالیٰ کو بذات خود کوئی نقصان نہیں پہنچا کیونکہ وہ خیر فی المحفوظین اور خیر محفوظاً ہے۔ اگر خیر فی الحافظین اور خیر حافظاً ہوتا تو وہ ضرور اپنے رسول کی پوری حفاظت کرتا اور بہتر حفاظت کرتا کہ وہ ذرا بھی زخمی نہ ہو سکتے ان کو کسی طرح کا صدمہ نہ پہنچ سکتا۔ اسی طرح قرآن کی بھی پوری حفاظت کرتا کہ اس کا کوئی حرف بھی ضائع نہ ہو سکتا اور اس میں کسی طرح کی کمی بیشی یا ردوبدل نہ ہو سکتا۔

یہ مقصد تھا خیرٌ حفظاً کی قرأت گھڑنے کا، جس کی تہ میں درحقیقت وعدۂ حفاظت قرآن کو کمزور کرنے کا مقصد خبیث پنہاں تھا اسی کی پیش بندی کیلئے یہ قصہ تصنیف کر لیا گیا تھا کہ جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی مجروح ہو گئے تھے یہاں تک کہ آپ کے دو دندان مبارک بھی شہید ہو گئے تھے اور سر مبارک میں خود کی کڑی دھنس گئی تھی اور اس من گھڑت واقعے کو اتنی رنگ آمیزیوں کے ساتھ احادیث وتواریخ وسیر کی کتابوں میں لوگ درج کرتے رہتے کہ یہ ایک یقینی وقطعی واقعہ سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ خیال کرنا تھا کہ اگر واقعی آپ بنفس نفیس اس قدر زخمی ہوئے ہوتے تو یقیناً آپ کی تسلی وتشفی کے لئے قرآن مبین میں کچھ آیتیں اتری ہوتیں اور

زخمی ہونے کا ذکر قرآن مبین میں ضرور ہوتا۔

درحقیقت جنگ احد[1] میں آپ کے مجروح ہونے کا واقعہ دو مقصد کے ماتحت گھڑا گیا اور مشہور کیا گیا۔ ایک تو وعدۂ الٰہی کو جھوٹا

---

[1] جنگ احد میں فتح کے بعد مجاہدین سامانِ مشرکین کے بٹورنے میں مصروف ہوگئے اور اپنے آلات حرب کنارے رکھ کر دشمنوں کی طرف سے بالکل مطمئن اور غافل ہوگئے اور گھاٹی پر جو کچھ محافظ مقرر کئے گئے تھے وہ یہ دیکھ کر کہ اب تو جنگ ختم ہوگئی اور پوری فتح حاصل ہوگئی، اب یہاں رُکے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگرچہ بعض اہل فہم محافظین نے کہا کہ جب رسول اللہ صلعم نے ہم لوگوں کو یہاں متعین کر دیا ہے تو بلا اجازت یہاں سے ہٹنا نہیں چاہئے۔ مگر اکثریت ناتجربہ کاروں کی تھی اس لئے ان لوگوں نے یہی رائے قائم کی کہ حکم حالتِ جنگ تک کے لئے تھا جنگ تو ختم ہوگئی اب یہاں رکے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ غرض یہ رائے قائم کرکے تنے چند کے سوا باقی سارے محافظ گھاٹی چھوڑ کر میدانِ جنگ میں اُتر آئے اور آلاتِ حرب رکھ کر وہ سب بھی مشرکین کے سامان لوٹنے لگے کہ اچانک مشرکین کی فوج کا وہ حصہ جو اس گھاٹی کی طرف تھا اور ان محافظین کی وجہ سے آگے نہیں آسکتا تھا آگے بڑھا اور جو تنے چند محافظین وہاں رہ گئے تھے ان سبھوں کو قتل وشہید کرکے میدان جنگ تک پہنچ گیا اور غافل مسلمانوں پر اچانک ٹوٹ پڑا مسلمان اس وقت نہتے بغیر آلات حرب کے تھے۔ کوئی آلات حرب کی طرف دوڑا کوئی مارا گیا۔ کوئی ادھر کوئی ادھر۔ غرض عالم انتشار و اضطراب میں سب کے سب پڑ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ منظر دیکھ کر بتقاضائے بشریت گھبرا گئے۔ لوگوں میں بھاگ دوڑ بے تحاشا ایسی تھی کہ لوگوں کے دھکے سے آپ گر گئے، اور کچھ دوسرے لوگ بھی آپ پر آ گرے کچھ مقتولین بھی اور کچھ زخمی بھی یہانتک کہ آپ ان لاشوں میں چھپ گئے۔ مشرکین آپ کی تلاش میں تھے۔ جب آپ کو میدان میں نہیں پایا تو سمجھے کہ وہ بھی قتل ہی ہوگئے اور انہیں لاشوں کے انبار میں کہیں ہوں گے۔ یہ سمجھ کر بعض مشرکین۔ نے شور مچا دیا کہ آپ مارے گئے۔ عبداللہ بن قمئہ حارثی نے اپنی نام آوری کے لئے لوگوں سے کہدیا کہ میں نے ان کو مار ڈالا۔ اس شور کو مسلمانوں نے سنا تو مسلمانوں کو بڑا قلق اور صدمہ ہوا گویا ان پر غم والم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

مشرکین یہ سمجھے کہ جو اصل باعثِ جنگ تھے وہ تو مارے ہی گئے اب جنگ کی کیا ضرورت ہے اس لئے وہ رک گئے۔ مسلمان تو بے سروسامان تھے ہی۔ یہ غم والم میں چور سوچ میں پڑ گئے۔ غرض اس طرح جنگ رک گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاشوں کو کسی طرح اپنے جسم مبارک سے سرکا کر اس انبار کے نیچے سے نکلے اور نکل کر آپ نے دیکھا کہ میدان سنسان ہے۔ مشرکین اپنی قیامگاہ کی طرف جمع اور مسلمان اپنی قیامگاہ کی طرف تو آپ نے آواز دی مسلمانوں نے جو آپ کی آواز سنی تو سب کے سب دوڑے اور آپ سے لپٹ گئے اور اس شمع ہدایت پر پروانہ وار فدا ہونے لگے۔ جنگ رک ہی چکی تھی۔ مشرکین کے بھی کافی لوگ مارے جا ہی چکے تھے۔ ان میں بھی اب کمر کھول دینے کے بعد پھر لڑنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ مسلمان تو فتح کے بعد یہ صورتِ ہزیمت دیکھ کر چور ہی تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ صحیح و سلامت پا کر اس ہزیمت کا سارا صدمہ بھول گئے۔ اگر آپ حکم دیتے تو سب کے سب پھر اسی حالت میں لڑنے کیلئے تیار ہو جاتے۔ مگر آپ نے بھی اس وقت مصلحت یہی دیکھی کہ اب پھر جنگ جاری نہ رکھی جائے باقی واقعات تاریخ کی کتابوں میں دیکھئے۔

غرض اس سے زیادہ کوئی بات نہ تھی۔ اسی پر آنحضرت صلعم کے زخمی ہو جانے، دندانِ مبارک کے شہید ہو جانے، خود کی کڑی کے سر میں دھنس جانے اور آپ کے لہولہان ہو جانے کا اضافہ منافقین عجم کی طرف سے ہوا ہے۔ اور اس سلسلے میں متعدد ایسی ایسی روایتیں بنائی گئیں جن سے آپ کے زخمی ہو جانے کا واقعہ صحیح سمجھا جائے (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

Marfat.com

یا کم سے کم کمزور ثابت کرنے کے لئے۔ دوسرے اس لئے کہ قرآن مجید کے وعدۂ حفاظت کو بھی اسی پر قیاس کر کے کمزور و مشکوک ثابت کیا جاسکے اور قرآن کے بعض حصوں کے ضائع ہو جانے کی جو روایتیں یہ لوگ بیان کریں اور اس وقت کوئی قرآن کی حفاظت کے متعلق وعدۂ الٰہی پیش کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا وعدہ اور اس کے باوجود آپ کے سخت زخمی ہونے کا واقعہ اور آپ کے بعض حصہ بدن یعنی دندان مبارک کے توڑ دیئے جانے کا حال بیان کر کے یہ کہا جاسکے کہ جیسا وعدۂ حفاظت اللہ نے اپنے رسول کے ساتھ کیا تھا اور جس طرح اس وعدے کو پورا کیا ویسا ہی وعدہ اپنی کتاب کی حفاظت کا بھی کیا اور اسی طرح اس وعدے کو بھی پورا کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس حفظا کی قرارت کے پردے میں اللہ تعالیٰ، اللہ کے رسول، اللہ کی کتاب، سب کی مخالفت کا پورا سامان پوشیدہ رکھا گیا ہے اور ان تمام مخالفتوں پر گہرا پردہ ڈالنے کے لئے اس حفظا کی قرارت کے ساتھ خیر حافظ اور خیر الحافظین کی قرارت بھی لکھدی گئی مگر یہ دونوں رسم خط کے مخالف بھی ہیں اور بلاغت میں کمزور بھی۔ اگرچہ حفظاً سے دونوں ہی بہتر ہیں کیونکہ انا لہ لحافظون کے جواب میں حافظ اور حافظین فاعل ہی کے صیغے ان میں بھی ہیں اور بلاغت میں کمزور اس لئے ہیں کہ ممیز و تمیز کی ترکیب میں ابہام کے بعد جو توضیح آتی ہے وہ ایک طرح سے مفید حصر ہو جاتی ہے، اور یہ بات ترکیب اضافی میں نہیں ہے اور یہاں ضرورت تھی مفہوم حصر کی۔ کیونکہ حصر میں دوسروں کا انکار ہوتا ہے تو گویا حضرت یعقوبؑ نے فاللہ خیر حافظا کہہ کر بیٹوں کے دعویٰ انا لہ لحفظون کا در پردہ انکار بھی کردیا۔ غرض جو بلاغت فاللہ خیر حافظا میں ہے وہ اس سوا کسی دوسری ترکیب میں اس جگہ آہی نہیں سکتی۔ علامہ جنیؒ نے معلوم نہیں کس سطحی نظر سے دیکھا کہ ان کو حفظا ہی کی قرارت میں ابلغیت نظر آئی۔

افسوس ہے کہ یہ بحث بہت طول ہو گئی اور عام ناظرین کو ممکن ہے کہ الجھن سی محسوس ہو مگر میں نے اس کی ضرورت محسوس کی اس لئے اس قدر لکھ گیا ناظرین معاف فرمائیں۔

۸۔ محاذِ تفسیر یہ ایک بہت اہم محاذ ہے جو قرآن مجید کے خلاف قائم کیا گیا۔ اس محاذ کے ماتحت بھی متعدد محاذ ہیں مثلاً "محاذ شانِ نزول" "محاذ وقف و وصل" "محاذ تقدم و تاخر نزول" "محاذ اسرائیلیات" وغیرہ۔ میں نے اپنے مسودے میں محاذ شانِ نزول اور محاذ وقف و وصل کو محاذ تفسیر سے الگ مستقل طور سے لکھا ہے مگر اس وقت چونکہ محاذ قرارت کے سوا دوسرے محاذوں کا ذکر محض تعارفی طور سے ضمناً کر رہا ہوں اور کسی دوسرے محاذ پر مفصل گفتگو اس وقت مقصود نہیں ہے،

(بقیہ از صفحۂ گذشتہ) اور محدثین و مفسرین و مورخین نے ان سب بکذوبہ روایتوں کو اپنی کتابوں میں درج کرلیا۔ ان بزرگوں نے راویوں پر اعتماد کیا اور یہ خیال نہ کیا کہ ان روایتوں کو وعدۂ حفاظتِ نبوی جو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اس کی تکذیب کیلئے منافقین نے گھڑا ہے اور اس وعدے کی تکذیب کے پردے میں وعدہ حفاظتِ قرآن مجید کی توہین و تکذیب بھی مقصود ہے۔ بلکہ اصل مقصود یہی ہے۔ اسی مقصد کے لئے آپ کے زخمی ہوجانے کا قصہ بنایا گیا۔ واللہ المستعان علی ما یصفون۔ ۱۲ منہ غفرلہ

Marfat.com

اسلئے بنظر اختصار محاذ شانِ نزول کو بھی محاذ تفسیری کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ اور محاذ وقف و وصل کی ایک مثال سورہ یوسف کی آیت وھمت بہ وھم بھا لولا ان رای برھان ربہ کی کسی دوسرے محاذ کے ضمن میں گذر چکی ہے۔

منافقین عجم کی ایک جماعت نے جو ایک محاذ تفسیر کا بھی قرآن مجید کے خلاف قائم کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید کی آیات کا جو صحیح مفہوم ہے اس کے خلاف مفہوم پیدا کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے مگر یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ ایک فصیح و بلیغ عبارت کا مفہوم قائل کے منشا کے خلاف بیان کرنا جس کو سننے والے اور پڑھنے والے قبول کر لیں کھیل نہیں ہے۔ آخر اس آیت کو دوسرے لوگ بھی تو پڑھتے ہیں، وہ لوگ بھی تو عربی زبان سے پوری طرح واقف ہیں وہ اس آیت کی عبارۃ النص کے خلاف کوئی مفہوم کیوں ماننے لگے؟ تو اس کے لئے شان نزول کی روایتیں گھڑیں۔ یعنی پہلے ایک ایسا واقعہ تصنیف کیا جس پر اس آیت کو چسپاں کیا جاسکے۔ پھر اس آیت کو اسی واقعے سے متعلق کر کے یہ مشہور کیا کہ یہ آیت فلاں واقعے کے وقت اتری تھی اور اس کے مفہوم کا تعلق اسی واقعے سے ہے۔ مثلاً سورۂ احزاب کے چوتھے رکوع کی چھٹی آیت: وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی واقمن الصلوٰۃ واتین الزکوٰۃ واطعن اللہ ورسولہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ (اور اپنے گھروں کے اندر رہا کرو، اور جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنا نکھار نہ دکھاؤ۔ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو، اور اللہ کی اور اللہ کے رسول کی فرمانبرداری کرتی رہو۔ (یہ جو تمہیں خصوصیت کے ساتھ کہا جارہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ) اے رسول کی گھر والیو! اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور ہٹا دے اور اچھی طرح تمہیں پاک کر دے۔)

یہ رکوع کا شروع ہی اس جملے سے ہے کہ یا ایھا النبی قل لازواجك (اے نبی تم اپنی بیبیوں سے کہدو) اس کے بعد آخر رکوع تک ہر آیت یا نساء النبی کہہ کر شروع ہوئی ہے یعنی اس آیہ تطہیر کے بعد بھی ایک آیت اور ہے جس کی مخاطب وہی نساء النبی ہیں۔ مگر اسی رکوع کے درمیان کی ایک آیت جو یا نساء النبی ہی کے ساتھ شروع ہوئی ہے جس کو ہم نے مع ترجمہ بھی اوپر نقل کیا۔ اس آیت کے آخری ٹکڑے کو یعنی انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ٹکڑا ازواج مطہرات کو نہیں کہا گیا ہے اس کی مخاطب وہ نہیں ہیں بلکہ حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں جن کا پورے قرآن میں کہیں کوئی ذکر نہیں۔ خلاف سیاق و سباق، خلاف عبارۃ النص قرآن سے بالکل باہر ایک نئی بات جو یہاں ٹھونسی گئی ہے اس کی دلیل پوچھئے تو کہیں گے کہ اس چھٹی آیت کا یہ آخری ٹکڑا اپنی ایک الگ شان نزول رکھتا ہے اور یہ آدھی آیت حضرت علیؓ اور ان کی بیوی اور بچوں کی شان میں اتری ہے اور اس کے لئے ایک واقعہ گھڑا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں حضرت علیؓ آئے اور حضرت فاطمہؓ و حسنؓ و حسینؓ سب یکجا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر بچھائی اور اس چادر پر ان چاروں کو بٹھایا پھر اس چادر کے چاروں کونوں کو اٹھا کر اپنی ایک مٹھی میں لیکر آسمان کی طرف کہا کہ اللھم ھولاء اھل بیتی اور پڑھا کہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ اور اسی طرح متعدد طرق سے متعدد و مختلف عنوان سے یہ واقعہ روایت کیا گیا ہے اور کئی صحابیوں پر

Marfat.com

ان کی روایت کا بہتان باندھا گیا ہے ہیں نے ان سب روایتوں کی کھلی تنقید کی ہے جو ایک رسالے ہی کی صورت میں ہے اس کا نام ہیں نے تطہیر آیۃ التطہیر من ھفوات الرواۃ فی التفسیر۔ افسوس ہے کہ اس کا مسودہ بھی قلمی ہی پڑا ہوا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس واقعہ مکذوبہ کی روایت کا کوئی سلسلہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک یا دو شیعہ راوی نہ ہوں اور کوفیوں کی تو یہ روایت گھڑی ہوئی ہے اس لئے تقریباً ہر سلسلہ روایت میں کوفیوں کا ہونا تو ضروری ہے۔ راویوں کے تشیع سے قطع نظر بھی کیجئے تو آخر عقل و درایت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اگر یہ واقعہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ ان چاروں حضرات کی شان میں یہ آیت اتری؟ یہ واقعہ تو صاف بتا رہا ہے کہ یہ آیت پہلے ہی اتر چکی تھی مگر اتری تھی ازواج مطہرات کی شان میں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ان چاروں عزیزوں سے بھی بہت محبت تھی اس لئے آپ کی محبت عامہ نے اس کو گوارا نہ کیا کہ یہ شرف خصوصی صرف ازواج مطہرات ہی کو حاصل رہے، اس لئے ان چاروں کے لئے بھی دعا کی کہ اللھم ھولاء اھل بیتی اے اللہ یہ لوگ (بھی) میرے اہل بیت ہیں، میرے گھر والے ہیں اس لئے ان لوگوں سے بھی ناپاکی دور کر دے اور ان کو بھی اچھی طرح پاک کر دے۔ اور ان لوگوں کی تشفی کے لئے یہ آیت اس وقت پڑھ دی۔ اگر یہ آیت پہلے سے اتری ہوئی نہ ہوتی تو اس وقت اس طرح اس کے پڑھنے کے کیا معنی تھے اور اللھم ھولاء اھل بیتی کہنے کا کیا مطلب تھا؟ کیا اللہ تعالی نعوذ باللہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے رسول کے اہل بیت کون لوگ ہیں؟ کیا اللہ تعالی کو رسول بتا رہے تھے کہ میرے اہل بیت تو یہ لوگ ہیں تو نے میری بیبیوں کو میرے اہلبیت کیوں کہدیا؟ اور یہ آیت میری بیبیوں کو مخاطب کر کے کیوں نازل کی؟

اور اگر یہ بتانا مقصود تھا کہ سورۂ احزاب کے چوتھے رکوع کی چھٹی آیت کا آخری ٹکڑا ان چاروں کی شان میں نازل ہوا ہے تو آپ کا فرض تھا کہ مسجد میں صحابہ کو بلا کر مجمع میں صحابہ کو مخاطب کر کے یوں فرماتے کہ یا ایھا الناس ھولاء اھلبیتی۔ اے لوگو، یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں اور اس وقت یہ آیت پڑھتے۔ نہ کہ حجرے میں اللہ تعالی ہی کو مخاطب کر کے کہا جائے کہ اللھم ھولاء اھل بیتی یہ تو بالکل لایعنی سی بات ہوئی۔ قرآن کا یہ بھی ایک اعجاز ہی ہے کہ اس طرح کی تقریباً جتنی جھوٹی جھوٹی روایتیں شان نزول وغیرہ کی بنائی گئی ہیں ان سبھوں میں اللہ تعالی نے انھیں وضاعین و کذابین سے ایسی ترکیبیں ان روایتوں میں رکھوا دی ہیں جن سے ان روایتوں کا کذب روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مگر تعریف کیجئے روایت پرستی کے جذبات کی کہ شیعوں کو تو نہ پوچھئے اہل سنت محدثین بھی روایت پرستی کے جذبے کے ماتحت ایسی واضح مخالف قرآن و خلاف عقل و درایت روایتوں کو بھی صحیح سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ بھی "اہل بیت رسول" سے حضرات علی و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم ہی کو مراد لیں گے۔ کبھی ازواج مطہرات کو اہل بیت رسول نہیں کہیں گے۔ حالانکہ قرآن نے ازواج مطہرات ہی کو اہل بیت رسول قرار دیا ہے۔

جاہل لوگوں کو یہ لوگ دھوکا دیا کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ اگر چھٹی آیت کے اس ٹکڑے کی بھی مخاطبت ازواج مطہرات کی طرف ہوتی تو عنکم اور یطھرکم میں کم ضمیر جمع حاضر کی مذکر نہ آتی، مونث آتی۔ مگر جو لوگ ادب عربی سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں اھل کا لفظ اگر عورت کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے تو اس کی طرف ضمیر جمع مذکر ہی کی پھرتی ہے چاہے وہ صرف اہل ہی کا لفظ ہو

یا اہل بیت مرکب اضافی کی صورت میں ہو۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس سے اپنی بیوی کو لیکر چلے اور راستے میں آگ کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے الخ تو اس کو یوں فرمایا گیا ہے اذ قال لاھلہ امکثوا انست نارا الآیہ دیکھئے حضرت موسیٰؑ کی ایک ہی بیوی تھیں مگر جب ان کو اہل کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تو اُمکثُوا جمع مذکر کا صیغہ ان کے لئے لایا گیا۔ حضرت موسیٰؑ ہی کی پرورش کے لئے جو ایک دودھ پلانے والی عورت کی فرعون اور اس کی بیوی کو تلاش تھی تو ان کی بہن نے فرعون اور اس کی بیوی سے کہا کہ ھل ادلکم علی اھلبیت یکفلونہ۔ کیا ہم تمہیں پتہ بتائیں ایک گھر والی (عورت) کا جو اس بچے کی کفالت کرے؟ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ بلائی گئیں اور حضرت موسیٰؑ اپنی ماں کی گود میں واپس آگئے جس کو دوسری جگہ فرمایا گیا ہے فرجعنٰك الی امك کے تقر عینھا ولا تحزن دپھر ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف واپس کردیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ رہے۔ حضرت موسیٰ اپنے گھر واپس نہیں آئے تھے۔ رہتے تھے فرعون ہی کے گھر میں۔ مگر اپنی ماں ہی کی گود میں پرورش پا رہے تھے۔ اس لئے صرف اپنی ماں ہی کو ملے تھے ان کو اھل بیتٍ کہا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شریف عورت اچھے گھر والی۔ بیتٍ میں تنوین عظمت ظاہر کرنے کے لئے۔ مگر اس کی طرف ضمیر جمع مذکر کی پھری اور یکفلونہ فرمایا گیا۔ اسی طرح جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے آکر فرزند کی بشارت دے رہے تھے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی حضرت سارہؑ سامنے کھڑی تھیں اولاد کی بشارت سن کر تعجب سے کہنے لگیں کہ کیا میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ اتعجبین من امر اللہ رحمت اللہ وبرکاتہ علیکم اھل البیت کیا تم اللہ کے کام پر تعجب کرتی ہو، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں تم پر لے اہل بیتِ ابراہیم۔ یہاں البیت پر الف لام عوض مضاف الیہ آیا ہے اور عہد خارجی کا فائدہ دے رہا ہے۔ عہد کے اعتبار سے معنی ہوں گے "اس گھر یہ گھر" اور عوض مضاف الیہ ہونے کی حیثیت سے معنی ہوں گے "اھل بیت ابراھیم" دیکھئے حضرت ابراہیمؑ کی ایک بیوی کو پہلے تو واحد مونث کے صیغے سے مخاطب کرکے تعجبین کہا گیا مگر جب اہلبیت کہکر مخاطب فرمایا گیا تو وہی کم جمع مذکر کی ضمیر لائی گئی۔

اشعار عرب میں بھی اس کی مثالیں بہت ملیں گی۔ عمرو بن العارض کا ایک قصیدہ ہے۔ پورے قصیدے میں مخاطب محبوب کی طرف حسب دستور شعرائے عرب واحد مونث ہی کی ضمیر پھری ہے۔ مگر اہل کے لفظ کے ساتھ اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہیں تو اس کی طرف جمع مذکر ہی کی ضمیر پھیرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں ؎

یا اھل وُدّی انتم املی ومن ۔۔۔ نادٰکم یا اھل ودی قد کفی

اے میری محبت والی تو میری امیدگاہ ہے اور جس نے ۔۔۔ تجھے پکارا اے میری محبت والی تو پھر اس کیلئے کافی ہو گیا

بلکہ عورتوں کی طرف یوں بھی جمع مذکر کی ضمیر پھیری جاسکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مخنث صحابی کے متعلق اپنی بعض ازواج مطہرات سے فرمایا تھا کہ لا یدخلن علیکم ھذا۔ اس حدیث کے بعض دوسرے جملے بھی ادبی حیثیت سے معرکۃ الآرا ہیں جن کے معنوں تک شارحین حدیث بھی نہ پہنچ سکے چونکہ وہ شاعر نہ تھے۔ طوالت کے خوف سے اس بحث کو یہاں نہیں چھیڑتا ہوں اور

پھر موضوع سے بھی وہ بحث بالکل خارج ہے۔[۱]

اور پھر بعض روایتوں میں یہ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز یا اکثر علی الصباح ازواج مطہرات کے حجروں کے پاس جاتا کر باواز بلند فرماتے تھے کہ السلام علیکم یا اھل البیت[۲] باوجودیکہ ازواج مطہرات کے حجروں میں وہی ہوتی تھیں اور کوئی نہیں ہوتا تھا مگر ضمیر جمع مذکر ہی کی استعمال کی جاتی تھی۔ اور ازواج کو اہلبیت ہی کہکر مخاطب کیا جاتا تھا۔

اس کی مثال اردو زبان میں بھی دیکھ لیجیے "محل" کا لفظ مذکر ہے مگر زوجہ یعنی بیوی کے معنی میں آتا ہے تو مذکر ہی رہتا ہے۔ زید کا پہلا محل، دوسرا محل ہی کہیں گے۔ پہلے محل کی اولاد، دوسرے محل کی اولاد بولتے ہیں۔ پہلی اور دوسری کوئی کہے تو غلط ہے۔

اسی طرح آیہ کریمہ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون (پارہ ۶) (اے مسلمانو!) تمہارے دوست تو صرف اللہ اللہ کے رسول اور وہ مومنین ہیں جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہتے ہیں اور جھکے رہنے والے ہیں۔) اس آیت کی شانِ نزول تصنیف کی گئی کہ ایک بار حضرت علیؓ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک سائل آیا اور (باوجود اس کے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ نماز پڑھ رہے ہیں) ان سے کچھ مانگا۔ حضرت علیؓ نے بحالتِ رکوع اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال کر گرادی اور وہ سائل لے کر چلا گیا۔ تو یہ واقعہ گھڑ لینے کے بعد مشہور کیا گیا کہ الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون سے حضرت علیؓ مراد ہیں کہ انھوں نے حالتِ نماز میں زکوٰۃ ادا کی۔ حالانکہ یقیمون اور یؤتون اور ھم اور راکعون یہ سب جمع کے صیغے ہیں۔ ان کلمات سے کبھی کوئی شخص واحد نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر[۲] حضرت علیؓ کے بحالتِ رکوع انگوٹھی خیرات کرنے کا واقعہ صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ ایک بار کا واقعہ تھا جس کے ہو جانے کے بعد یہ آیت اتری تو صیغہ ماضی لانا تھا اور یہاں زمانۂ حال سے تا زندگی زمانہ مستقبل مراد ہے، کیونکہ ایسے مواقع میں مضارع کے صیغے مفہوم استمرار کے لیے آتے ہیں۔ یقیمون الصلوٰۃ کے معنی ہیں نماز قائم رکھتے ہیں یعنی برابر نماز پڑھا کرتے ہیں۔ یؤتون الزکوٰۃ کے معنی ہیں زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔ کیا حضرت علی جب جب نماز پڑھتے تھے تو ہر مرتبہ بحالتِ رکوع زکوٰۃ دیا کرتے تھے؟۔

پھر[۳] زکوٰۃ ایک صدقہ معین کا نام ہے جس کی مقدار صاحبِ مال کی مالی حیثیت کے مطابق حساب سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت علی کسی زمانے میں بھی مالدار نہ رہے کہ ان پر زکوٰۃ فرض ہو۔ ایک انگوٹھی خیرات کرنے کو کبھی ادائے زکوٰۃ نہیں کہا جاسکتا۔ زکوٰۃ ایک صدقۂ مفروضہ کا نام ہے اسلئے زکوٰۃ کو صدقہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہر زکوٰۃ صدقہ ہے مگر صدقہ کو زکوٰۃ نہیں کہہ سکتے کیونکہ صدقے کی صرف ایک قسم زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کے علاوہ صدقے کی بہت سی قسمیں ہیں جن کو زکوٰۃ نہیں کہہ سکتے۔ اور اس شانِ نزول کے راویوں کو دیکھیے تو کوئی طرح

---

[۱] اس حدیث میں ایک عورت کے حسن کی تعریف یوں ان مخنث صحابی نے بیان کی تھی کہ تُقبِلُ بِاَربَعٍ وَتُدبِرُ بِثَمَانٍ۔ یعنی چار چیزوں کے ساتھ سامنے آتی ہے اور آٹھ چیزوں کے ساتھ پیٹھ پھیرتی ہے۔ شارحینِ حدیث اس بلیغ عبارت کے معنی نہ سمجھ سکے نہ علمائے اہلِ حدیث میں سے آج تک کوئی سمجھ سکا۔

[۲] اس طرح نماز صبح کے لئے ہوشیار فرماتے تھے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

روایت ایسا نہیں ملے گا جس میں کوئی نہ کوئی شیعہ نہ ہو اور تقریباً ساری روایتیں کوفے کی ٹکسال کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ان سب روایتوں کی بھی میں نے تنقید کی ہے جو ایک مختصر سے رسالے کی صورت میں بشکل مسودہ میرے پاس موجود ہے۔ حالانکہ آیت کا مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے۔ راکعون یہاں اپنے لغوی معنی میں خاضعون کے مفہوم میں یعنی یہ لوگ جن کو زکوٰۃ دیتے ہیں تو تواضع وانکسار کے ساتھ تاکہ لینے والا یہ نہ سمجھے کہ ہمیں حقیر سمجھ رہے ہیں۔ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے اس میں مومنین کی شان بتائی گئی ہے کہ ان کو اذلة علی المومنین اعزة علی الکافرین ہونا چاہئے یعنی ایمان والوں کے سامنے جھکے ہوئے منکسر اور کافروں کے مقابل غالب و باوقار۔ اسی اذلة کے مفہوم کو یہاں راکعون سے ادا کیا گیا ہے۔

اور اس آیت کا سلسلہ تو اوپر سے ہے۔ شروع رکوع میں فرمایا گیا ہے یایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء (الآیہ) اے ایمان والو یہود و نصاریٰ کو تم اپنا دوست نہ بناؤ۔ تو پھر کس کو دوست بناؤ؟ اس کو بتایا گیا کہ انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین اٰمنوا (الآیہ) یعنی تمہاری دوستی کے لئے تو اللہ ہے، اللہ کے رسول ہیں اور جتنے مومنین ہیں سب ہیں۔ تم غیروں سے دوستی کیوں قائم کرتے ہو؟

اور اس طرح کی شانِ نزول وغیرہ کی روایتیں اور عام تفسیری روایتیں جو باہم متضاد و مختلف ہونے کے علاوہ اکثر تو ایسی ہی ہیں جو آیات قرآنی کے سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہیں۔ اگر دیکھنا ہوں تو تفسیر ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کو دیکھ جائیے۔ اگرچہ ان سے متقدم مفسرین کا ذکر بھی کتابوں میں ہے مگر سب سے پرانی جو تفسیر مسلمانوں کے ہاتھوں میں صدیوں سے چلی آرہی ہے جس کی خوشہ چینی دوسرے سب مفسرین کرتے رہے ہیں وہ یہی ابن جریر طبری کی تفسیر ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اس محاذ تفسیر میں ہم ابن جریر طبری سے ناظرین کو متعارف کرادیں۔ ابن جریر طبری[1] کے حالات و کوائف سے انشاء اللہ جلد دوم میں بحث کی جائے گی۔ یہاں جلد اول کو ختم کرتا ہوں۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خاتم النبیین وعلیٰ اٰلہ وصحبہ و خیار امتہ اجمعین۔

---

[1] جلد دوم کا یہ حصہ جو ابن جریر سے متعلق ہے اس کی افادی حیثیت کے پیش نظر الگ ہفتہ وار طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ جلد دوم کے بقیہ حصے کے ساتھ اس کو انشاء اللہ کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا جائے گا۔

(ناشر)

Marfat.com

عرض ناشر

اعجاز القرآن علامہ تمنا عمادی کی تصنیف ہے جو ماہنامہ طلوع اسلام میں اپریل ۱۹۵۳ء سے مسلسل شائع ہونا شروع ہوئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ ہر مہینہ اس کے آٹھ صفحات طلوع اسلام میں شائع کئے جاتے رہیں گے تا آنکہ کتاب مکمل ہو جائے۔ مگر ماہنامہ کی تنگ دامانی اکثر اس ارادہ میں حائل ہوتی رہی اور وقتی اہم مضامین کی وجہ سے اس تصنیف کے لئے مسلسل جگہ نہ نکل سکی بلکہ صرف چار اشاعتوں میں آٹھ آٹھ صفحات کے حساب سے اس کے کل بتیس صفحات شائع ہو سکے۔ اس کے بعد طلوع اسلام کو ہفتہ وار کر دیا گیا اور طے کیا گیا کہ ان شائع شدہ ابتدائی بتیس صفحات کو بقایا مسودہ کے ساتھ شامل کر کے اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ یہ کتاب اب پیش خدمت ہے۔

کتاب کے بتیس صفحات چونکہ ابتداءً طبع کئے جا چکے تھے اس لئے کتاب کی فہرست بھی حسب معمول کتاب کے شروع میں نہیں دی جا سکی بلکہ آخر میں لگائی جا رہی ہے۔

علامہ تمنا عمادی کا ہمارے دل میں کس قدر احترام ہے اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن چونکہ طلوع اسلام کا مسلک جامد تقلید کا مسلک نہیں اس لئے اس کے ابتدائی حصہ میں (جو طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے) اگر ہمیں کہیں اختلاف رائے ہوا تو اس پر ہم اپنی رائے ساتھ ساتھ ظاہر کرتے چلے گئے ہیں لیکن باقی حصہ جو اب کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے اس میں اس صورت کو مناسب نہیں سمجھا گیا۔ کتاب چونکہ خود مصنف کے نام سے شائع ہو رہی ہے اس لئے جن حضرات کو اس سلسلہ میں کچھ تحقیق کرنے کی ضرورت ہو تو وہ فاضل مصنف سے براہِ راست رجوع فرمالیں۔ ان کا پتہ یہ ہے :- ۶۴ عبد العزیز لین - پیل خانہ - ڈھاکہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام

کراچی

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین اعجاز القرآن جلد اول

مضامین	صفحہ
آغاز کتاب و تمہید۔	٢
قرآن کی تحدی (چیلنج)	″
کفار کی ہٹ دھرمی بجواب تحدی۔	″
ہٹ دھرمی کرنے والوں کے لئے پھر چیلنج۔	٣
قرآن کا پہلا دعوی اور اس کے تین قسم کے مخاطبین۔	″
قرآن کی لاریبیت	٤
قرآن کا دوسرا دعوی	″
قرآن کی فصاحت و بلاغت ہی قرآن کا اصلی اعجاز نہیں ہے۔	٥
قرآن کا اعجاز کیا ہونا چاہئے۔	″
فرق امیال و عواطف۔	٦
فرق اَدوار و عُہود۔	″
عہد نبوی سے خلافت بنی عباس تک۔	″
دوسرے وجوہ اعجاز کا رفتہ رفتہ ظہور۔	″
موجودہ زمانہ۔	٧
یورپ کی عینک لگا کر قرآن کا مطالعہ۔	″
مدارس عربیہ کی طرف سے بے توجہی	″
مرحوم علامہ طنطاوی کی سعی رائیگاں۔	٨

مضامین	صفحہ
راویان احادیث تفسیر	٩
فرقہ بندیوں کی مضبوط بنیادیں	″
اگلی اور پچھلی تفسیروں کا غبار	″
قرآن اور گلستان سعدی و شاہنامہ فردوسی وغیرہ	″
وقت کا تقاضا	١٠
وجۂ اعجاز	″
ضرورت واقعی	″
عصر حاضر کی مصلحت وقت	″
ایک نمایاں اعجاز کے ذریعے لاریبیت کا ثبوت	″
اللہ کے دعوے اور اللہ کے وعدے	″
دوسرے دعوے اور وعدے	١١
لاریبیت	″
تواتر خبر	″
تواتر کی تعریف	١٢
تواتر کی قسمیں اور قرآن مبین	″
تواتر اسنادی	″
تواتر مسند، تواتر مسند الیہ، اور تواتر اسناد	١٣
تواتر مکانی	١٤
تواتر زمانی	١٥

Marfat.com

مضامین	صفحہ
تواتر ذاتی	١٥
تواتر اجزائی	″
تواتر مجموعی	″
لولا نزل علیہ جملۃً واحدۃً	″
تواتر تعلیم و تعلم	١٨
تواتر قرأت	″
تواتر کتابت	″
مکہ و حوالی مکہ میں یہود و نصاریٰ و صابئین کی بود و باش	″
جنگ بدر کے قیدیوں کا فدیہ	٢٠
حضرت فاروق اعظمؓ کے اسلام کا واقعہ	″
حضرت خبابؓ بن الارث	″
صحیفہ حضرت خباب بن الارث	″
مہاجرین صحابہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے	٢١
عَلَّمَ بالقلم	″
اہل عرب اور صحابہ کی مہارت فن کتابت و املاء و انشاء	٢٢
اہل عرب خصوصاً اہل حجاز کو ان پڑھ سمجھنا نہایت خطرناک غلط فہمی ہے	″
تواتر تلاوت	٢٣
تواتر حفظ	٢٤
تواتر دور	٢٥
تواتر تدبر	″
سورۂ اعراف کے آخری رکوع کی پہلی آیت	٢٦

مضامین	صفحہ
تواتر استنباط	٢٧
ماحصل	″
تواتر مصنوعی	٢٨
جمع قرآن کا واقعہ	″
قرآن مجید کا دوسرا دعوٰی	٣٠
اس دعوے کا واضح ثبوت	٣١
قرآن مجید کے بعض نسخے	٣٢
اور نیل لائبریری پٹنہ (صوبہ بہار)	″
خواجہ حسن نظامی دہلوی	″
چند سوالات	″
حضرت علیؓ کے جمع قرآن کا شاخسانہ	″
شیعوں کی کتب حدیث کا بیان	″
قرآن مجید کے بعض قدیم و نایاب نسخے	٣٤
حضرت عثمان، حضرت علی اور امام حسن رضی اللہ عنہم کے مبارک ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآن	٣٥
کیا قرأت حفص کے مطابق تھے؟	″
الحمد للہ کہ قرآن مبین کا ہر دعوٰی صحیح ثابت ہوا۔	٤٩
جمع قرآن	″
ان علینا جمعہ و قرآنہ	″
قرأت قرآن	″
قرأت اور تلاوت کے معانی	″
اُمّی کے معنی	٥٢
بیان قرآن	٥٣

مضامین	صفحہ
رسول اللہ صلعم کی مفوضہ خدمتیں	۵۳
بیان وتبیین رسول میں اختلاف نہیں ہو سکتا	۵۴
قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے ہر سورۃ کے کلمات وحروف حرکات وغیرہ کی تعداد	۵۵
پارے اور رکوع	؍
سات منزلیں	؍
رسم خط	۵۶
رسم خط بدلنے کی وجہ	۵۷
کاتبین وحی کی مہارتِ فن	۵۸
"واؤ" اور "لام الف" کے فرق کی وجہ	؍
ضرورت وعدۂ حفاظت	۶۰
نسخ آیات کی بحث	؍
ذمہ داری ذمہ دار کی قوت وقدرت کے مطابق ہی ہونی چاہیے۔	؍
حفاظت امتحانی وغیر امتحانی	۶۱
حقیقت حال	۶۲
ابتدائی حملے	؍
پہلی صدی کے بعد کے حملے	؍

مضامین	صفحہ
متعدد محاذوں کا قیام	۶۳
قرآن کے خلاف ملاحدۂ عجم کی منافقانہ سازشیں۔	۶۵
قرآن سے محدثین کی غفلت	۶۸
قرآن مجید سے عناد	۷۲
بعض صحابہ کی جمع احادیث کی روایتیں	۷۳
ایک سوال	۷۷
بے اعتنائی میں عناد کی جھلک	۸۱
محاذِ جمع	۸۲
محاذ حفظ	۸۴
محاذِ قرأت	۸۵
محاذ ناسخ ومنسوخ	؍
محاذ لغت	۸۶
محاذ صرف ونحو	۸۹
محاذ فصاحت وبلاغت	۹۴
تمیز کی بحث	۹۷
یہاں کون ابلغ ہے	۹۸
محاذ تفسیر	۱۰۲

Marfat.com

قرآن کا بلند پایہ معاشی منشور

ادارۂ طلوع اسلام کی وہ گران بہا پیش کش جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی یعنی پرویز صاحب کی وہ بلند پایہ تصنیف جو مصنف کے پچیس سالہ تدبر فی القرآن کا نچوڑ ہے اور جس پر انہیں بجا طور پر فخر ہے کہ انہیں خدا نے یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ وہ قرآن کے اس معاشی نظام کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جس کی نظیر دنیا کا کوئی معاشی نظام پیش نہیں کر سکتا۔ کارل مارکس نے کمیونزم کا معاشی منشور پیش کیا تھا اس کے مقابلہ میں پرویز صاحب قرآن کا معاشی منشور یعنی

نظامِ ربوبیت

پیش کرتے ہیں۔ اسے مطالعہ فرما کر فیصلہ کیجئے کہ قرآن کے اس معاشی منشور کے پہلو میں مارکس کا معاشی منشور کہیں جگہ پانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟

کمیونزم اپنا معاشی نظام طاقت اور قوت کے زور پر نافذ کرتی ہے مگر قرآن انسان کی بصیرت کو اپیل کرتا ہے اور اس کا نظام دل کے سرچشمہ سے پھوٹتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اپنے اندر کوئی محرک جذبہ نہیں رکھتا مگر قرآن کا فلسفہ اپنے متبعین کو وہ جذبۂ محرکہ عطا کرتا ہے جس کے بل پر آج سے چودہ سو سال پہلے انسانیت اس انقلاب عظیم کو جلوہ بار دیکھ چکی ہے جس کو دوبارہ دیکھنے کے لئے پوری کائنات آج تک چشم براہ ہے۔

نظامِ ربوبیت

اس معاشی نظام کو پیش کرتی ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے انسانیت کو عطا کیا تھا اور جسے محمد رسول اللہ اور ان کے رفقائے کبار نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا تھا مگر بعد میں جسے ملوکیت کی خود غرضانہ مفاد پرستیوں نے تو بر تو پردوں میں چھپا دیا تھا۔ "نظامِ ربوبیت" ان غلافوں کو قرآن سے اٹھا کر اس کے معاشی نظام کو دوبارہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ کتاب بڑے سائز کے تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اسلئے اسے دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنا فلی جلد مضبوط معہ گرد پوش۔ قیمت چھ روپے۔

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ۔ قیمت چار روپے۔ دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

Mirza Mohammad Hussain B. Com.
Education Deptt., Lahore.

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

اعجاز القرآن

جلد اوّل

من الفقیر الی ربہ الباری تمنا العمادی المجیبی
الفلواری المہاجر کان لہ ربہ فی الاول والآخر

شائع کردہ
ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

Marfat.com